جوار بھاٹا

جوار بھاٹا

افسانے

راما نند ساگر

ناشران

میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز لاہور

دوسرا ایڈیشن ۱۰۰۰ سنہ ۱۹۴۴ء قیمت ۔ ۳ے
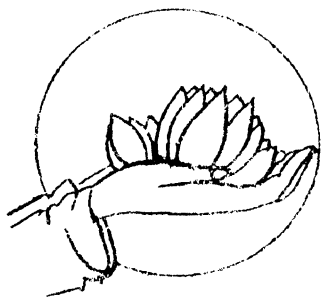
اُس کے ارپن

جس نے فرمایا ہے کہ :-

"..... تو جو کھائے۔ جو آہوتی دے۔ جو (دان) دے۔ جو تپ کرے اور چاہے جو کچھ بھی تو کرے۔ وہ سب کچھ تو میرے ارپن کر..."

(گیتا۔ ادھیائے ۹)

"....تم کہو۔ کہ میری نماز۔ میرے تمام اعمال و تنت (حتیٰ کہ) میری زندگی اور میری موت اللہ تعالےٰ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے"

(قرآن سپارہ ۸۔ سورۃ الانعام)

راما نند ساگر

فہرست

دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ

جوار بھاٹا کا دوسرا ایڈیشن پیش کرتے وقت ہمیں اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں نے اس مصنف کو ادب اردو کی محفل میں پیش کیا۔ جس نے اس محفل میں داخل ہوتے ہی اسکی ادبی صف میں اپنی جگہ پیدا کر لی اور جس کا شمار آج اردو کے چند ایسے گنے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جوار بھاٹا کو شائع ہوتے ہی وہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو اردو کے جدید افسانوی ادب کی بہت کم کتب کو میسر آسکی۔ چند مہینوں ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن کاغذ کی نایابی وغیرہ قسم کی چند مجبوریوں کے باعث ہمیں تاخیر برداشت کرنی پڑی۔ جسکے لئے ہم صاحب کتاب کے مداحوں سے عفو خواہ ہیں۔

جوار بھاٹا اور اسکے مصنف جناب رامانند ساگر کی تعریف میں ایسی ایسی ہستیوں کے قلم جنبش میں آچکے ہیں۔ جنہیں ہندوستان بھر میں ادب اردو کے متعلق سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ قریب قریب تمام مستند ادبی رسائل نے انکے کمال فن کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ انکے متعلق ہمارا مزید کچھ لکھنا انکے شایان شان نہ ہوگا۔ ہمارے لئے تو یہ فخر کیا کم ہے۔ کہ نہ صرف جوار بھاٹا بلکہ انکے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "**آئینے**" بھی ہمارے وساطت سے پیش

کیا جا رہا ہے۔

مصنف نے محفلِ ادب میں اپنے لئے جو اہم جگہ پیدا کر لی ہے۔ اسکے پیشِ نظر ہم پر آئندہ زمانے کے ادبی مورخ کو یہ اطلاع پہنچانا لازم آتا ہے۔ کہ اسمیں مصنف کے چند بالکل ابتدائی افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں: تاکہ اسکے فن کی تمام ارتقائی منازل کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ مثال کے طور پر مصنف نے اپنی زندگی میں جو پہلا افسانہ لکھا۔ وہ "کنبہ کے بعد" ہے۔ چنانچہ ہر افسانہ کے ساتھ تصنیف کی تاریخ لکھ دی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں جن عزیزوں کی مدد ہمارے شاملِ حال رہی۔ ان میں سے جناب رام لال طائر اور مشہور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی کے ہم خاص طور پر بہت ممنون ہیں۔ کہ اوّل الذکر کی وساطت ہی سے ہم مصنف سے متعارف ہوئے اور مؤخر الذکر نے نہایت محنت سے ہمارا بھاٹا پر ایک سیر حاصل تنقیدی دیباچہ لکھا۔

ناشران

پیش لفظ

ادبی طوائف الملوکی کے ان دنوں میں افسانے کے متعلق کوئی کلیہ قائم کرنا مشکل ہے۔ واقعات اور حالات کے نوع بہ نوع بیان یا تاثرات کی ایک لمبی سی فہرس کو بھی افسانے کے نام سے پیش کیا جاتا ہے تاہم بالزک کے اس قول کو کہ "There is essentially a story افسانے میں قصہ یا کہانی (افسانویت) لازم او جود ہے" کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ اب یہ افسانویت یا کہانی پن کیا ہے اسے معین الفاظ میں بیان کرنا نہ صرف بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے بلکہ اس کی تعریف میں زیادہ الجھاؤ پیدا کرنا ہے۔ جتنے افسانے ہیں اتنی ہی تعریفیں ہیں اور کسی معین تعریف کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ہمیں منطقی [illegible] انداز میں، اور پرکے الفاظ میں سے ایک منفی دلیل کی تلاش ہوتی ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ اس ایک واقعہ[1] کا بیان جس میں "محض حالات کا نوع بہ نوع بیان یا تاثرات کی لمبی سی فہرس نہ ہو ——— افسانہ ہے!

رامانند ساگر کے افسانے دیکھنے سے مجھے دو باتوں کا احساس ہوا جن میں سے

---

[1] واقعہ یا سرگزشت جس کے بیان سے پہلے ظاہر یا غائبانہ طور پر "ایک واقعہ کا ذکر ہے" کی کیفیت لازم ہو ———

اول یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں (باستثنیٰ "موت کے بستر سے") میں خواہ وہ اسکیچ کی طرف مائل ہوں یا نہ ہوں کہانی کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔ ان کے افسانے محض وقوعات کی فہرس یا دل کو برگشتہ کر دینے والے بیانات نہیں ہوتے۔ کہانی، جس کا ایک نقشہ ان کے ذہن میں ہے، بنانے کے لئے وہ ایک فنکار کیطرح اپنے آلات استعمال کرتے ہیں، تاکہ اسے ایک معین شکل دی جائے۔ دوسری خوبی جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہے وہ اُن کی عوام تک پہنچنے کی کوشش ہے جس کے حصول کے لئے وہ بارہا فن کی بھی اتنی پروا نہیں کرتے اور فطرتاً ایسی نفسیاتی الجھنوں کو لانے سے گریز کرتے ہیں جو ایک عام سمجھ بوجھ والے آدمی کی فہم پر کسی طرح بار ثابت ہوں، انہیں نخوتی (snobbish) ادب سے للہی عناد ہے اور میرے خیال میں ان کی یہی ایک صفت انہیں عوام میں روز مرّہ زیادہ مقبول کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ صفت ایسی ہے جس کے حصول کے لئے بالآخر نخوتی ادیب کو بھی بعد از ہزار رسوائی عوام کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔

رامانند ساگر کے بعض افسانوں میں مصلح کا جذبہ اور جذبات پرستی پائی جاتی ہے جسے چھپانے کی انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی۔ "یوں ہوا" کا واقعہ انہیں اتنا مرغوب نہیں جتنی کہ انہیں "ایسا ہونا چاہیئے" کی سرگزشت عزیز ہے۔ اس بات کی موجودگی بظاہر کرتی ہے کہ انہیں خواص کی نسبت عوام زیادہ عزیز ہیں۔ عوام مصلح پسند اور جذبات پرست ہوتے ہیں اپنے دماغ پر بہت زیادہ زور دیکر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے اور ہمیشہ اس بات

کے خواہشمند رہتے ہیں کہ کوئی ان کے جذباتی مادے کو چھیڑ دے جس سے ان
کا تصور آب و تاب رنگ ، ایک نئی حد یا دونمود صنع کرلیں اور ان کی آنکھوں میں
سیلاب امڈ آئے ۔ یا وہ کوئی راہبر و مصلح چاہتے ہیں جو ان کے سامنے کوئی
راستہ رکھ دے اور وہ چپکے سے اس پر گامزن ہوتے رہیں ۔ پہلے پہلے وہ
اس شخص کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن جب اس مصلح و رہبر کی
چند بنیادی باتیں ان کے ذہن میں کھپ جاتی ہیں تو وہ دل و جان سے اس
کے پیچھے لگ جاتے ہیں ۔ بعض فن کار اس بات کا علم رکھتے ہوئے بھی کہ
اس قسم کی اصلاح پسندی و جذباتیت فن کے منافی ہے ۔ اپنے نقوش میں
بالارادہ اصلاح و جذبات رکھتے ہیں ۔ یہ تجربہ نیا نہیں ہے ۔ طالسطائی کے
متعلق کہا گیا ہے ——— "ناول نویسوں کے لئے خصوصاً جبکہ وہ حقیقت
نگاری کا دعویٰ کرتے ہوں ، یہ خلاف ادب مانا گیا ہے کہ وہ قصہ میں اپنے
خیالات کو اس طرح ظاہر کریں کہ وہ ایک پیغمبر معلوم ہوں یا افسانے کے
ذریعے سے اپنے کسی عقیدے کی کھلم کھلا تبلیغ کریں ۔ طالسطائی نے اس
قاعدے کی پرواہ نہیں کی ۔ اور شروع میں کم لیکن آخر میں زیادہ اپنے
خیالات اور عقیدوں کو ناولوں اور افسانوں میں بیان کرتا رہا ۔ کہیں کہیں پر تو
اس کی یہ تبلیغی کوششیں بے شک گراں گزرتی ہیں اور اصل داستان سے
الگ اور بے تعلق ہو جاتی ہیں مگر دوسری طرف دیکھئے تو ناول نویس کا دعوے
کہ وہ آدمی اور دنیا کو جیسی کہ وہ ہے ، دکھا سکتے ہیں ، محض دھوکا ہے ۔ فن
اور فن کے پیچھے مقصد ۔ ناولوں کا مطالبہ تو بس یہ ہوتا ہے کہ ناول نویس آدمی

رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۳۸ء

کے نام سے پتلے بنا کر نہ کھڑے کر دے اور زندگی کی واردانوں کے بہانے سے خیالی باتیں بیان کر کے نہ رہ جائے یعنی اسے آدمی کی سیرت اور زندگی کے کاروبار سے غیر معمولی طور پر اور سچی واقفیت ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ حقیقت اخبار نویسوں کی طرح آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرے یا اپنے جذبات کے دریا میں غوطے لگا کر۔ قصہ تو بہرحال سوچا جاتا ہے سیرتوں اور صورتوں کے نقش بنائے اور مٹائے جاتے ہیں جب تک کہ وہ اصل کے مطابق نہ ہو جائیں چنانچہ ان عقائد کے جواز میں طالسطائی کی "جنگ اور صلح" اور "انا کرنین" کے چند ابواب پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات طالسطائی کے خلوص کی تحسین میں جاتی ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں حقیقت اور افسانے کے درمیان فرق نہیں رکھا۔ زیر نظر مجموعے کے افسانے "بڑا بھائی" میں مذکورہ بیان کے مطابق پہلی کوشش کہ وہ اسے آدرش یا مثالی بڑا بھائی بنا دے اصلاح پسندی اور جذبات پرستی کا ایک کامیاب نمونہ ہے ہری شنکر کی مرتی ہوئی ماں کی دعا ـــــــ "بھگوان تمہیں بوڑھوں جتنی عقل دے" اور دعا کا کارگر ہو کر اسے قبل از وقت متین اور سنجیدہ بوڑھا بنا دینا اور ہری شنکر کا اپنے بھائی کے عوض جان پر کھیل جانا جذبات کی انگیخت کے لحاظ سے خوب ہے لیکن انسان کی فطری کمینگی کے پیش نظر گزور۔ لیکن اس تجربہ کے باوجود آنکھوں سے بے اختیار آنسو اُمڈے چلے آتے ہیں اور عام انسان کا ردِعمل بھی ہے۔ جہاں تک طالسطائی کے کلیے کے آخری حصّے کا تعلق ہے، مناسب ارتقائی مراحل طے نہ کرنے کی وجہ سے ساگر کے اس افسانے کی

حقیقت اور افسانے کے درمیان کی تقسیم کی لکیر صاف دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف عوام کے دل کو ٹٹولنے کے پیش نظر عمداً حقیقت کو نظر انداز کر دے۔

افسانہ "یہ بھی آدمی ہیں" انسانی تہذیب و تمدن پر ایک لطیف طنز ہے ایک ننھا پرندہ پیدائش کے چند روز بعد کسی باغ میں ریشمی کپڑوں میں ملبوس بچوں اور نفیس جھلمل کرتی ساڑھیاں پہنے کیاریوں میں خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ کر استعجاب سے اپنی ماں سے پوچھتا ہے ——— "ماں یہ کون ہیں؟" اور جواب پاتا ہے "یہ آدمی ہیں" تو اس کے ننھے سے دل میں آدمی بننے کی خواہش موجزن ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے پروں میں قوت پرواز پیدا ہوتی ہے تو اُسے جھلمل کرتی ساڑھیوں سے پرے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے لڑتے ہوئے مزدوروں کے جھونپڑے دکھائی دیتے ہیں تو وہ ویسے ہی حیرت سے ماں سے سوال کرتا ہے ——— "ماں یہ کون ہیں" تو وہ جواب دیتی ہے "بیٹا یہ بھی آدمی ہیں" اور اس کے چھوٹے سے دل کو دھچکا لگتا ہے۔ Liam. o. Flaherty نے اس رنگ میں بہت سی حکایات و طنزیات لکھی ہیں اور وہ بہت کارگر ہیں۔ اسیطرح اس افسانے میں مصنف کا دل ایک پرندے کے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے اور نوزائیدہ پرندہ بطور Vehicle (آلۂ کار) کے نہایت موزوں ہے کیونکہ وہ دنیا کی اقدار سے واقف نہیں اور مصنف کو انسان کے غیر متوازی رجحانات کے متعلق طنز کرنے کا موقع دیتا ہے۔ مصنف پرندے کی Detached صورت میں نوعِ انسانی کو دیکھتا

ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس آدمی بننے سے تو بہیں پرندہ ہی اچھا ہوں۔ قدرت
ہیں ان کے گزارے کے لئے افراط سے ہے اور انسان، قدرت سے دور، افتادہ
چاندی سونے کے ایک ظالمانہ مبادلے کے نیچے پس رہا ہے۔

"رزنیا تو" میں ایک ایسے دوکاندار کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جیسے دوکاندار
نفرت ہے جو خریداروں کو سودا دیتے ہوئے جھنجلا اٹھتا ہے اور جو شاعر مزاج
اور دوکان کو اس لئے بند رکھتا ہے کہ آج آسمان پر بادل چھائے ہیں اور
نہایت عمدہ ہے۔ نتیجۃً نہ وہ شاعر بنتا ہے اور نہ دوکاندار۔ مصنف کے الفاظ
کردار کی سرشت ہے ——— "بابو! آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے
پر خود منزل کو قربان کر دیا ہو یا وہ شخص جس نے اپنی کشتی کو زیادہ مضبوط بنا
کے لئے اس کی مرمت کروائی ہو اور اس مرمت کے عوض اپنی وہی ناؤ ڈبو ڈا
ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے دیکھو جس نے شاعری کو
دینے کے لئے ایک حسین سے عقد کیا اور اس کے عوض اسی شاعری کو نذر کر
اور اسے پڑھتے ہوئے کسی بھی آدمی کو اس میں اپنی زندگی کے المیہ کی جھلک
دکھائی دینا تعجب انگیز بات نہیں۔

"جاہل" میں کلیان کی کردارنگاری بہت اچھی ہے۔ وہ ہر وقت ہنستا
ہے۔ دق کا مریض ہے۔ "جو بہت ہنستا ہے، سمجھو کہ وہ بہت زیادہ دکھی
کے الفاظ کے بعد اس کا ہر قہقہہ ایک دلگداز نالہ بن جاتا ہے۔ اور جب کوئی
بیٹے کا ہم شکل لڑکا "للت" اس سے چھین کر لے جاتا ہے تو اس کا تمام ضبط
اس کی تمام وضعداری رخصت ہو جاتی ہے اور دبائے ہوئے جذبات

اُمڈ آتے ہیں جیسے نطشے کے رحم کے جذبات جنہیں وہ ساری عمر دباتا رہا تھا۔ آخر
عمر میں ایک زخمی گھوڑی کو دیکھ کر اُبل آئے تھے اور وہ بے تحاشہ رو دیا تھا۔ آخر
میں کلیان خود کشی کر لیتا ہے"۔ "جاہل" کی تصویر قابل داد ہے ــــــ[1] "اُس کے
جسم کی بناوٹ بھی کچھ عجب قسم کی تھی۔ مضبوط جبڑے ایک آہنیں عزم ظاہر
کرتے تھے اور عقابی ناک اسے زیادہ ہیبت ناک بنا رہی تھی لیکن اس کے خلاف
آنکھوں میں کرختگی کا نام و نشان نہ تھا۔ اُس کی نگاہوں میں جیسے شیرینی تھی
اُس کی ہر وقت ڈبڈبائی رہنے والی آنکھوں کے آگے پانی کی ایک ہلکی سی اوٹ
ہوتی جس کے پیچھے سے ان میں مظلومیت کا رنگ جھلکتا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تھیں
جو اس کی ظاہری شکل سے پیدا ہونے والی کرختگی کو ایک حد تک ملائم کر دیتی تھیں
یا پھر اس کی چال جس میں ٹانگوں کی مضبوط گٹھن کے باوجود لڑکھڑاہٹ یہ ظاہر
کر رہی تھی کہ یہ اس مسافر کی طرح غیر یقینی استقلال رکھتا ہے جسے اپنی
منزل کا رُخ ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہو۔ اور جو محض چلتے جانے کی خاطر ڈگمگاتے
ہوئے قدم اٹھاتا ہوا چلا جاتا ہے"۔

"تشنۂ تکمیل" میں ایک سیلاب ہے جو کہ پڑھنے والے کو بہا لے جاتا ہے اسکے
علاوہ "وزیر اعظم" "کلرک" "ماسٹر جی" وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔ اور یہ ان افسانوں پر
ہی موقوف نہیں۔ "موت کے بستر سے" جو کہ بظاہر ایک ڈائری ہے ہمیں نئی افسانوی

---

[1] مصنف ایک تپ دق کا مریض ہے اور حال ہی میں سینے ٹوریم سے شفا حاصل کر کے آیا ہے۔ اقتباس میں ہنگام رخصت ــــ جبکہ وہ عزیز و اقربا سے اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے آخری بار مل رہا تھا کے تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔

کا مواد دیتی ہے مثلاً ـــــــ

یکم مئی کو لاہور سے چل کر آج رات سری نگر پہنچا۔ لاہور سے روانگی کا نظارہ تصور میں آتے ہی آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ دوستوں کا ہجوم اور پھر اس مجمع پر یہ خیال غالب کہ "مبادا یہ ہماری آخری ملاقات ہو" اس جذبہ کی موجودگی میں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح سارے کا سارا مجمع آنسوؤں سے لدا ہوا ایک بادل دکھائی دے رہا تھا۔ دوستوں کا منہ پھیر کر آنسو پونچھ لینا اور پھر میری طرف ہنستے ہوئے دیکھنا۔ وہ اپنی دانست میں مجھے بنا رہے تھے لیکن درحقیقت میں انہیں بنا رہا تھا۔ میں ان کی ہنسی کے پس پردہ چھما چھم برستے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کھل کر بات نہیں کرنے پاتا تھا اور میں جانتا تھا کہ ان کے گلے آنسوؤں سے بھر آئے ہیں۔ اس منحوس بیماری کا خیال بھی مجھے جس قدر پریشان نہ کر سکا اس سے زیادہ تکلیف مجھے اس رقت انگیز نظارہ نے پہنچائی۔

ـــــــ تیسری بات جو ساگر میں دکھائی دیتی ہے وہ احساسات کی لطافت ہے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق دق ان کی حساس طبیعت کا شاخسانہ ہے۔ اگرچہ اس کی ناقص شکل کہ دق کے مریض کی حسیات بہت تیز ہو جاتی ہیں بھی اتنی ہی درست ہے۔ بلکہ حکما کا قول ہے کہ یہ کمزوری طبیعت میں ایک خاص قسم کی Sensitiveness پیدا کر دیتی ہے جو کہ عام آدمیوں میں دیکھنے میں

نہیں آتی بعض وقت یہ کسی کے Genius کا سبب ہوتی ہے۔ بہرکیف یہ تو درست ہے کہ جس شخص کو یہ مرض ہو اس کے احساسات نہایت تیز ہو جاتے ہیں۔ جنسی رغبت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان احساسات کی تیزی اور جذبات کی فراوانی نے مجھے ان کے مطالعہ کی طرف مائل کیا اور فی الواقع ان کی تحریر کا وہ حصہ جو ان کی بیماری سے متعلق ہے نہ صرف انشا پردازی کا ایک اچھا نمونہ ہے بلکہ میری توقع کے بموجب ایک انسانی دستاویز Human Document ہے ——

جب سے پتہ چلا کہ میں تپ دق کا ایک مریض ہوں ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ ماضی اپنے دامن میں میری تشنۂ تکمیل آرزوئیں لئے نہایت بیدردی سے مسکرا رہا ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے جیسے کسی نادان کسان نے اپنی تمام محنت ایک ایسے کھیت کو سیراب کرنے میں صرف کر دی ہو جس میں حسرت کے پودوں کے سوا کچھ نہیں اُگا کرتا۔

اگر تپ دق کا مریض وقتی طور پر بچ بھی رہے تو کیا۔ عمر بھر کے لئے داغدار ہو جاتا ہے۔ یوں کہو کہ قدرت نے ایک تیر نکلش چھوڑا ہے جس کی خلش اب تاحیات نہ جا سکے گی۔ ایک عجیب کیفیت ہے گویا میرا مہد حیات زندگی اور موت کے ہچکولے کھا رہا ہے۔

میرے عزیز دوست طاہر کی چٹھی آئی ہے اس کے جذباتی قلم نے دل کے تاروں کو کچھ اس طرح چھیڑ دیا ہے کہ ایک پرسوز نغمہ گونج اُٹھا ہے اور ایک رقاصہ کے ازخود تھرک اٹھنے والے پاؤں کی مانند دو شوخ آنسو بھی آنکھوں کے پردوں میں تھرکنے لگے ہیں ایک شوخ اور ننھا سا بادل دھوپ میں نہا رہا تھا کہ اس نظارے کی تاب نہ لا کر وہ بھی رو دیا۔

گھر والوں کو مریض کا جسم پیارا ہوتا ہے جذبات نہیں

اچانک ارکان قضا و قدر ان کی ہنستی دنیا کو دیکھ کر جل اُٹھے اور اپنی کمان پر چلہ چڑھا کر وہ تیر چھوڑا جس کا پھل اسکے پہلو میں ٹوٹ گیا۔

—— دق کے مرض کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں کیونکہ یہ ایک تیر نیمکش" یا ایک ایسا تیر ہے جس کا پھل پہلو میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اور موت آتی ہے پر نہیں آتی کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ساگر کی تحریر کا مایہ خمیر دق یا دوسرے لفظوں میں نازک احساسات ہیں۔ یہ اونچے فن کے معیار و محک پر کسے جا سکیں یا نہ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تپ دق کے مریض کے جذبات کی تراوش جو ان صفحات میں مرقوم ہے ایسی ہے کہ کوئی شخص انہیں پڑھنے

کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اس شخص کے تاثرات جس کا اپنا قول ہے کہ سینے ٹوریم میں چلے جانا اتنا بڑا سانحہ نہیں جتنا کہ اس قعر عمیق سے صحیح و سلامت واپس چلے آنا۔ بلکہ ڈائری کے آخر میں ایک سخت طنزیہ پیرایہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومتوں نے دق سے بچنے کے لئے سینے ٹوریم تو بنا دیئے ہیں لیکن سینے ٹوریم سے بچ نکلنے کے بعد معاش کے لئے کلرکیوں اور محنت کشی کی زندگی میں پھنس کر پھر دق مول لے لینے کا کوئی علاج نہیں سوچا۔

سینے ٹوریم میں بسنے والوں کا مذاق کس قدر ہیبت ناک ہے وہاں کی غم و اندوہ سے بھری ہوئی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو کہ موت کے پس منظر میں نہایت خوفناک دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھار ایک اچھے افسانے کا مواد بہم پہنچاتے ہیں —— "سینے ٹوریم کی مغموم فضا میں کبھی کبھی چند مریضوں کی بوالعجبیاں تفریح کا سامان پیدا کر دیتی ہیں۔ اگلے روز ایک مریض نے ڈاکٹر پہ جھوٹ موٹ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے سخت بخار ہے تھرمامیٹر کو بغل میں بینے کی بجائے رضائی کے اندر رکھی ہوئی کانگڑی (ایک طرح کی انگیٹھی) پہ کچھ دیر رکھ کے دکھا دیا۔ تھرمامیٹر دیکھا تو ہنسی کے مارے ڈاکٹر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ درحقیقت پارہ ۱۱۰ ڈگری تک جا چکا تھا! —— بوالعجب ہنگامہ گرم است در بازار ما"

بقول "نہ تنہا شاعر مانند طبیبم" افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ساگر کی زبان سے اسکے شاعر ہونے کا بھی گمان ہوتا ہے۔ ان کے بیان میں شعریت

برجستگی اور خیالات میں وارفتگی دکھائی دیتی ہے اگرچہ شعروں کے کثرتِ استعمال نے اسے خواہ مخواہ صحافتی رنگ دے دیا ہے۔ لیکن وہ اشعار برمحل ہوتے ہیں اور ذہن پر گراں نہیں گزرتے ان کی شعریت سے بھری تحریر ملاحظہ ہو ——

گہرے اندھیرے میں سے پُل کی محرابیں ایک ایک کرکے اُجاگر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ عین اس طرح جیسے پانی کی اس خاموش روانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے میری زندگی کے وہ حسین اور سنہری لمحے باری باری ماضی کی یاد کے اندھیرے میں سے اُجاگر ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہیں میں زندگی کی چور کردینے والی کلفتوں کا واحد خوشگوار ماحصل سمجھتا ہوں ——

وہ لمحے جب کسی دوپٹے کے خونیں رنگ نے ہمارے دل کو خون کردیا جب کسی کے مسکراتے ہوئے لبوں نے ہمیں چرکہ لگایا جب کسی نے ہنستے ہنستے ہم سے دو باتیں کیں اور ہمارے دامن کو سدا بہار پھولوں سے بھر دیا۔ یا جب کسی نے جھکی ہوئی شرمیلی آنکھوں سے کچھ اس طرح دیکھا۔ گویا ایک تیر نیم کش چھوڑا ہو۔ یہی وہ لمحے ہیں جو ہمیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ جو رنگین خواب ہم نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کرتے ہیں وہ محض سراب نہیں بلکہ کبھی کبھی حقیقت کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ گو یہ لمحے انسان کی زندگی میں خال

غال آتے ہیں بانہمہ ان کا سلسلہ لامتناہی ہے کیونکہ ایسے لمحے
ہر شخص کی زندگی کے طویل اندھیارے میں کہیں کہیں ایک ابدی
روشنی کی مانند نور افشاں ہیں۔ چنانچہ ان رنگین روشنیوں کا
سلسلہ بھی بہت دراز ہے ـــــ اس جہلم کی طرح، بلکہ اس
سے بھی زیادہ۔ جہلم تو بیچ دریا سے مل کر اپنی تکمیل کر لیتا
ہے لیکن ان رنگین خواب نما حقیقتوں کا بیان ہمیشہ تشنۂ
تکمیل رہے گا۔

(تشنۂ تکمیل)

کہیں کہیں ساگر زندگی کے تلخ تجربوں کے پیش نظر جھنجلا اٹھتا ہے۔
"جاہل" میں جب نو آمدہ مریض کو اپنے کمرے میں ڈیڑھ سو روپے کی پوٹلی کے ساتھ
ایک رقعہ منجانب کلیان ملتا ہے تو اس پر تحریر ہوتا ہے "بھگوان کے لئے ان لوگوں
کو نہ بتانا۔ ورنہ یہ ظلم سے روپے چھین لیں گے۔" انکی تہذیب کا قانون یہی ہے
کہ وہ دے نہیں سکتا چھین سکتا ہے۔ "چھوٹا بھائی" میں کمل کی نفسیاتی
تحلیل خوب ہے ـــــ "سامنے امیرا کدل کے بازار میں ایک نوجوان لکڑی
کے ایک ڈنڈے پر نقلی سلک کی نکٹائیاں لگائے بیچ رہا تھا۔ اس نے شاید دو
سال ہوئے بی اے پاس کیا تھا۔ اس نے نکٹائیاں کمل کے آگے کر دیں۔ کمل
ٹھٹک گیا اور اسکے منہ کی جانب دیکھنے لگا وہ منہ سے کچھ نہیں بولا البتہ ایسی نظروں
سے دیکھتا رہا گویا کہہ رہا ہو کہ کس قسم کے پیچھے جا رہے ہو کمل بابو! ایک نئی
نکٹائی خرید لو۔ تمہاری نکٹائی پھٹ گئی ہے۔ تمہیں اسوقت قسم سے زیادہ

نکٹائی کی ضرورت ہے، پھر ایک کیا کئی قسم دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ارے دیکھتے کیا ہو۔ خریدتے کیوں نہیں۔ میری پھٹی ہوئی نکٹائی دیکھ رہے ہو جب میں کالج میں پڑھا کرتا تھا تو ہر روز نئی نکٹائی لگایا کرتا تھا اب بھی مجھے کہیں کلرکی مل لینے دو۔ اگر آدھی تنخواہ ہر مہینے نکٹائیوں پر نہ خرچ کر دوں تو کہنا۔ تمہیں کم از کم ایک تو ضرور خرید لینی چاہیئے۔ بڑے بھائی سے ڈرتے ہو۔ یہ قسم نہیں جو اس پر بھی قبضہ کرے" —— مذکورہ بالا بیان میں ہماری معاشرت پر ایک تیکھا نشتر بھی چلایا گیا ہے " —— اب مجھے کلرکی مل لینے دو —— تمہیں اسوقت کسم سے زیادہ نکٹائی کی ضرورت ہے، پھر ایک کیا کئی قسم دستیاب ہوسکتی ہیں ..... " اور اس میں اپنے تاثرات، دوسرے شخص کو علامت بنا کر منعکس کرنے کا فن قابلِ تحسین ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

تشنۂ تکمیل

کیا آپ نے کبھی خواب دیکھے ہیں۔ وہ خواب نہیں جو آپ نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ خواب۔ جو آپ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اُسوقت جب آپ چارپائی پر لیٹ تو جاتے ہیں۔ لیکن نیند نہیں آتی۔ یا پھر جب آپ کے پاس کوئی اور بات سوچنے کے لئے نہیں ہوتی۔ اور آپ موٹر میں کسی لمبے سفر پر جا رہے ہوتے ہیں۔ یا اگر خوش قسمتی سے آپ کو ریل میں تیسرے درجہ کا ڈبہ قریب قریب خالی مل جائے۔ اور آپ کا ہم مذاق وہاں کوئی نہ بیٹھا ہو۔ اور نہ وہاں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی حسینہ ہی بیٹھی ہو۔ تب اس سے بھی بہتر موقع وہ ہے۔ جب آپ کسی ننھی سی کشتی میں پاؤں پسارے اپنی نیم وا آنکھوں سے پانی کی ہموار سطح پر اپنے تئیں تیرتے ہوئے دیکھیں ——— جیسا

کہ اس وقت میں اپنے تئیں پار رہا ہوں۔ جہلم کا یہ سبزی مائل پانی کس قدر سکون بخش ہے۔ وہ سامنے امیرا کدل پل پر سے جو سڑک گذر رہی ہے اُس میں اور اس آبی شاہراہ میں کس قدر تفاوت ہے۔ وہ انسانی ہاتھوں سے بنائی ہوئی سڑک۔ شور و غوغا سے پُر۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی ــــــ ہر وقت راہگیروں کی ریل پیل۔ اور پھر ہر لمحہ خلافِ مرضی کسی واقف کار سے ملاقات کا حادثہ ہو جانے کا خطرہ۔ اور دوسری جانب یہ آبی راستہ۔ قدرت کے ہاتھوں ہموار کیا گیا ــــــ سکون زا۔ گرد و غبار کا نام تک نہیں ــــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار آپ نے لنگر کھول کے کشتی کو موجوں کے حوالہ کر دیا۔ کہ وسط دریا کی فضا نے آپ پر کچھ ایسا جادو کیا۔ کہ آپ جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھنے لگے۔ وہی خواب جن کا میں ذکر کر رہا تھا۔ اور مجھے ان خوابوں سے کچھ ایسا اُنس ہے کہ میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہوں۔ کہ امیرا کدل سے گھر جاتے وقت کشتی ہی میں سفر کروں۔ اور جب میں شکارے میں نیم دراز ہوا اپنے ارد گرد پانی کی لہروں کا ناچ دیکھ رہا ہوں۔ اور ناؤ کا کشمیری کھیویا بھی نہایت مہارت سے ڈانڈ چلاتا چلاتا اس فضا سے متاثر ہو کر اپنی زبان میں اور ایک خاص لے میں پکار اٹھتا ہے۔

اَنی رودہ و مدان دار و قدمن ہا لگئے پاری
ٹھہرا و قدم یار و کن تھو بودنئے زاری
در سینہ رٹم گرمی کرمہ شرمی نثرمی ۔ وہ
تس کو نہ ولس نرمی لیس پتھ مہ تجم خواری

(اے میرے حسین دوست - ایک ذرا ٹھہر جا - میں تیرے قدموں پر قربان - انہیں ذرا روک - اور کان دھر کے سن - کہ میری آہ و زاری کیا ہے -

میں نے شرارِ (عشق) کو اپنے سینہ ہی میں چھپا رکھنے کی سعی کی - اور شرماتے شرماتے ہی اپنا یہ حال کر لیا - اے خدا جس کے پیچھے میں نے اس قدر رسوائی اٹھائی اس کے دل میں کیوں نرمی نہیں آتی -)

اس وقت نہ پوچھیئے - کہ تصورِ انسان کو کہاں کہاں لے اڑتا ہے - اور پھر خوابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - میں ایک راہ بھول گئے شہزادہ کی صورت میں اپنے تئیں ایک جنگل میں پاتا ہوں - اور وہاں ایک نوجوان چھبیلی گوالن مجھ پر ترس کھا کر مجھے اوک سے ہی تھوڑا سا دودھ پلاتی ہے - دودھ پیتے پیتے میں آنکھیں اوپر اٹھا کر اسکی آنکھوں میں ڈال دیتا ہوں - دودھ میرے ہاتھوں سے پیتے ہوئے اوک میں سے چھلکتا چلا جاتا ہے - اور میں اسکے نینوں سے ٹپکتا ہؤا مدھورس پئے جاتا ہوں - حتیٰ کہ ساری کی ساری مٹکی خالی ہو جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں - اور دیکھتے ہیں - کہ زمین پر دودھ کی ندی بہ رہی ہے اور ہمارے سینوں میں محبت کے دریا ——— اور ان تینوں ندیوں کے سنگم پر میرا محل تعمیر ہو جاتا ہے جہاں راجکماری اور گوالن ———

اچانک میری نگاہ پیچھے کو جاتی ہے "کھویا بھی کسی" کا خواب دیکھ رہا ہے -

جو اس کی آنکھوں میں صاف ناچ رہا ہے۔ لیکن اسکے ہاتھ ایک بے جان مشین کی
کی طرح ڈانڈوں پر کام کر رہے ہیں۔ وہ دریا کے دھندلے کنارے کی جانب
نظریں گاڑے ہوئے ہے۔ جہاں پھیلتے ہوئے اندھیرے میں ایک کھڑکی میں
سے روشنی آرہی ہے۔ شاید وہاں "کوئی" ہے۔ جس کے خواب وہ بھی دیکھ رہا ہے
یا اس مکان اور مکان والی سے وابستہ کوئی رومانی افسانہ اُسے پھر سے
یاد آگیا ہے۔ ڈانڈ اب بھی اُسی طرح چل رہے ہیں ——— "شڑاپ
شر۔ شڑاپ شر۔ شڑاپ شر" اور شکارہ رواں ہے۔ میں پھر خواب
دیکھتا ہوں۔

ایسے سائیکل پر دفتر کو بھاگا جا رہا ہوں۔ کہ اچانک ایک موٹر کی جھپٹ
میں آجاتا ہوں۔ اور مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک لمبی بیہوشی
مجھ پر غلبہ پا لیتی ہے۔ بیہوشی سے قبل مجھے محض اتنا یاد ہوتا ہے۔ کہ میں
نے موٹر میں ایک شعلۂ جوالا دیکھا تھا۔ جسکی کنول ایسی آنکھوں سے آنکھیں ملتے
ہی مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ کہ میں اسکی موٹر کے آگے گر پڑا ——— اور جب
ہوش آیا۔ تب بھی انہی دو کنول کے پتوں ایسی لمبی اور گلابی ڈوروں والی آنکھوں
کو اپنے سامنے پاتا ہوں۔ وہ کنول کے ڈنٹھلوں ایسے دو بازو میرے پلنگ پر
رکھے اپنی لمبی مخروطی انگلیوں سے میری انگلیوں کو چٹکا رہی ہے۔ میں ایک
ہی نظر میں بھانپ لیتا ہوں۔ کہ یہ کوئی راجکماری ہے۔ اور میں ایک راج محل
میں ہوں۔ ہو بہو اسی طرح کا محل جس میں راجکمار اور گوالن کا خواب دیکھا
تھا۔ گویا میرے تصور نے جو محل اپنے مذاق کے موافق تیار کر رکھا ہے۔ ہر جگہ

مجھے وہی میسر آتا ہے۔ اسکی انگلیوں کے مس سے مجھے اپنے قلب و جگر میں ایک خوابیدہ نغمہ گونجتا سنائی دیتا ہے۔ گویا اس کی انگلیاں مضراب ہیں اور میری انگلیاں کسی ستار کے تار...... اچانک میں گھبراسا اٹھتا ہوں۔ اسکے سامنے اپنی حقیقت کھول دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ اُسے کوئی غلط فہمی نہ رہ جائے۔ لیکن پھر دل کہتا ہے۔ کہ ابھی آنکھ نہ کھول۔ اسی طرح بیہوش پڑا رہ۔ مبادا یہ حسین نغمہ حقیقت کے کرکش شور میں گم ہو جائے۔ میں آنکھیں بند کیئے رہتا ہوں لیکن زبان بے قابو ہو کر بول اٹھتی ہے "لیکن میں تو ایک غریب کلرک ہوں اجکماری ——" میرے کانوں میں ایک نقرئی گھنٹیوں ایسی آواز آتی ہے "ایسا نہ کہو۔ میرے راجہ" اور میں اپنے گالوں کے قریب کسی کا گرم گرم معطر سانس محسوس کرتا ہوں۔ فوراً آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ اور —— میں اور راجکماری ......

ملاح پھر گا رہا ہے۔

باغِ نشاط کے گلو نازکدان دلو

ضائع کرنفس بہ سوندرا ما یہ بران بران دلو

اے باغِ نشاط کے پھولو دریا اُن ایسے نازک شگفتہ رنگین اور دلکش حسینو، ناز خرامی کے ساتھ میرے قریب آؤ۔

لے میرے حسین محبوب تو نے نہ محض میرا دل ہی نہیں بلکہ سر سے لے کر پیر تک مجھے تباہ و برباد کر دیا اب بھی

وقت ہے ، ہر گام پر اپنی محبت میں اضافہ کرتا ہوا میرے قریب تر آ۔)

اس کی محبوب کا مکان دور رہ گیا ہے۔ چنانچہ نظروں سے اوجھل ہوتے وقت اس کے جذبات میں پھر جوش آ گیا ہے۔ یا کیا جانے کہ اسکی تصور کی آنکھیں اس کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کسی سلونے کو دیکھ رہی ہوں۔ جو دریا کی لہروں پر تیر کر پہنچنے والے اس گیت کی آواز کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اس کا خاوند پوچھتا ہے " تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے " تو وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی کہہ دیتی ہے۔ کہ " باہر سے دھواں آ رہا ہے " ——— تو کھڑکی سے اُٹھ آؤ ——— لیکن وہ وہاں سے اٹھتی نہیں۔ یا اُٹھ ہی نہیں سکتی۔ اسکے کانوں میں پیا کی پریم پکار گونج رہی ہے۔

باغِ نشاط کے گلو تاز کران کران دلو

اور کئی بار اُس نے عہد کیا ہے۔ کہ اب کے جب بھی یہ پریم پکار آئے گی۔ وہ دریا اور خشکی سے بے نیاز وسط دریا میں بہنے والی کشتی کی جانب بھاگ جائیگی۔ لیکن .... عشق کی مجبوریاں!

جہلم کی سطح پر ہمارا شکارہ رواں ہے اور میرے خواب ابھی کنارے کے مکانوں کی طرح ایک ایک کر کے گذرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں اپنے تئیں اپنے دفتر میں بیٹھا پاتا ہوں۔ ڈاک آتی ہے۔ میں اپنے نام کا لفافہ چاک کرتا ہوں کسی انجانے مدّاح کا ہے۔ لکھا ہے " آپکے افسانے ایک مدّت سے دیکھ

رہی ہوں۔ لیکن آپ کے تازہ ترین افسانہ "شمع" نے گویا مجھے بھی "شمع" بنا دیا ہے۔ خدا کے لئے اپنے افسانوں میں اس قدر سوز نہ بھرا کیجئے کسی کے نازک دل کا بھی خیال رکھیئے۔ کیا آپ کے دل میں سچ مچ اسی قدر سوز بھرا ہوا ہے؟ کیا آج تک کسی نے آپ کی اس آگ پر پریم کا پانی چھڑکنے کی کوشش نہیں کی۔ کاش میں ——" اور میں فوراً اس کا ہمت افزا جواب دیتا ہوں۔ جس کے جواب میں وہ اپنا فوٹو بھی بھیج دیتی ہے۔ اور پھر یکے بعد دیگرے کئی خطوط آتے ہیں۔ لیکن میں آگ لگا کر ایک دیوتا کی مورتی کی طرح خاموش رہتا ہوں۔ البتہ ہر نئے خط سے ایک نیا لطف نہ صرف میں بلکہ میری "چاند" بھی اٹھاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے۔ کہ مجھے حسینوں کے جذبات سے اس طرح کھیلنا خوب پسند ہے۔ اور ہر نئی حسینہ کے اسطرح "زخمی" ہونے کی خبر سنتے ہی وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرے ہونٹوں پر اپنے باریک باریک ہونٹ رکھ کر کہتی ہے "میرے جادوگر۔ تو تمہارے نئے افسانے کے لئے بھی پلاٹ مل گیا۔ اور سچ مچ مجھے ان ناکام عشق حسینوں کی جانب سے آنے والے خطوط میں قلمبند کئے گئے جذبات سے بہترین افسانے مل جاتے ہیں۔ اور انہی افسانوں کے باعث جن میں حقیقت کی تپش ہوتی ہے۔ میری شہرت کو پر لگ جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ جہلم میں بہتے بہتے اس "ناکام حسن" اور اس کی بنیاد دل پر کھڑے کئے گئے میرے قصر شہرت کا سلسلہ کنارے سے ٹکراتی ہوئی لہر دل کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کی طرح یہاں تک دراز ہو جاتا ہے۔ کہ میں یا میری چاند

جب بھی کسی حسینہ کے ہاں جاتے ہیں۔ تو وہاں میری تصویر ایسی جگہ ٹنگی ہوتی ہے
جہاں ہر وقت اسکی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس پر تازہ پھولوں کے ہار لٹکا ئے
ہوتے ہوتے ہیں۔ اور جس کسی کو میری تصویر میسر نہ آئی ہو۔ اس نے اپنے تصور
کی مدد سے ایک حسین نوجوان کی تصویر بنائی ہوتی ہے۔ اور میں ہر ایسے مکان
سے لوٹنے کے بعد اُسے ایک خط لکھتا ہوں۔ کہ "آج تمہارے پاس وہی شخص آیا
تھا۔ جس کی تصویر کو تم ہر صبح تازہ پھولوں سے سجاتی ہو"۔۔۔۔۔ اور پھر
تصور کی آنکھوں سے اس حسینہ کا چھٹپٹانا۔ ہاتھ آئے ہوئے پریتم کے اسطرح
نکل جانے پر بارے پچھتاوے کے ہاتھوں کو مل ملکر خون میں رنگ دینا اور پھر بے
چینی بڑھ جانے پر دیوانہ وار ہر در و دیوار سے پوچھتے پھرنا کہ "شاعر کہاں ہے؟
۔۔۔۔۔"۔ دیکھتا ہوں۔ یہ نظارہ ہوتے ہوتے اس قدر وسعت اختیار
کر جاتا ہے۔ کہ زمین و آسمان میں حسینوں کا ایک قیامت زا جمگھٹ ہے۔
اور ہر جانب سے یہی آواز آرہی ہے۔۔۔۔۔"شاعر کہاں ہے۔ شاعر کہاں ہے؟
۔۔۔۔۔" اور میں عین اس جمگھٹ کے درمیان بیٹھا مسکرا رہا ہوں۔ لیکن
پیار کی تہ یا دنی نے ان کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ ڈال دیا ہے۔ کہ وہ مجھ
ہی سے پوچھتی ہیں کہ "شاعر کہاں ہے۔۔۔۔۔" اور مجھے پہچان نہیں سکتیں
مجھی کو پکارتی ہوئی میرے گرد اگرد گھومتی ہیں۔ اور میں خاموشی سے مسکراتا
ہوا درمیان میں بیٹھا ہوں۔ اس حبہ کدل کے پل تلے اُس پر شور جھانجھری
کے وسطی نقطہ کی طرح۔ جس کے گرد اگرد بھنور کا پانی بھنواتا پھرتا ہے۔ آپ
شاید کہیں۔ کہ "تم نے تو خواب ہی خواب میں اللہ اور روح کی مفارقت باوجود

یکانگت" کا روحانی مسئلہ حل کر لیا ہے ـــــــ" لیکن یقین جانیئے۔ کہ میں مجازی پیار کی اس حد پر پہنچکر بھی جہاں کثرت وحدت میں سما جاتی ہے۔ ایسے روحانیت کا نام دے کر اپنے ان خوابوں میں سے تمام کیف نچوڑ دینے کو تیار نہیں۔ خواہ روحانی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ یا نہیں۔ میری بلا سے۔ میرے ہاں تو۔ ع

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

ڈانڈ ایک بندھی رفتار سے چل رہے ہیں "شڑاپ شر شڑاپ شر۔ شڑاپ شر"

سامنے جب کدل کے پل کی محرابوں سے لہریں ٹکرا رہی ہیں۔ اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھری جاتی ہیں۔ گویا یہ محرابیں دنیا کی وہ سنگین حقیقتیں ہیں جن سے انسان کے ولولے۔ اس کا پیار اور اس کے خواب ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ ان میں سے دراصل حقیقت کون سی ہے۔ وہ لمحاتی خواب۔ یا زندگی کی وہ تلخ کامیاں جنہیں عموماً حقیقت کہا جاتا ہے۔ خیال اپنا اپنا ہے۔ چنانچہ میں ان خوابوں ہی کو حقیقت سمجھتا ہوں۔ میری نظر وں میں زندگی کی تمام مشکلات اور تلخ کامیاں درحقیقت۔ یا صرف کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن کا صلہ ہمیں ان چند لمحوں میں ملتا ہے۔ جو سنہرے خوابوں سے رنگے ہوتے ہیں۔ آخر ان خوابوں کو "محض خیال غلط" کا نام دے کر ان سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو کیوں بے معنی بنا دیا جائے۔ کیوں نہ اسی کو حقیقت

مان لیا جائے۔ ورنہ یوں دیکھئے —— تو یہ دنیا۔ یہ زندگی۔ یہ انسان۔ یہ پریم۔ یہ سب کچھ بھی تو آخر خواب ہی ہے۔

ملاّح پھر منہ میں کچھ گنگنا رہا ہے۔ کنارے کے مکانوں سے روشنیوں کا عکس دریا میں لہرا رہا ہے۔ کنارے کے مندروں میں گھنٹے بجنے شروع ہو گئے ہیں اندھیرے اور دھند کے باعث نظر نہ آنے والے پنگھٹوں سے چوڑیوں اور چھاگلوں کے فردوس گوش چھناکے سنائی دے رہے ہیں۔ لیکن آخر یہ لہریں کیوں بڑھ رہی ہیں۔ میری کشتی کو انہوں نے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے۔ اب تو بیٹھنا بھی محال ہو رہا ہے۔ دریا کی سطح پر سکون ہے۔ پھر میری کشتی کے ارد گرد ہی یہ اضطراب کیوں۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی ہیں۔ گویا دہانِ آب سے سینکڑوں زبانیں نکلی ہوئی ہیں۔ کیا یہ کوئی پیغام کہہ رہی ہیں۔ کس کا پیغام —— شاید یہ اُسی نالہ کا پانی ہے۔ جو اُس ساٹھ میل دُور واقع دیہ میں سے آتا ہے۔ جس کے کنارے ایک پن چکی ہیں۔ وہ "گاؤں والوں کا آٹا پیسا کرتی ہے۔ تو کیا اُسی نے بہنے والے نالے کو یہ کہا تھا۔ "تم اُسی شہر میں سے گذرتے ہو۔ جہاں" وہ "رہتے ہیں۔ کبھی اُن سے مڈبھیڑ ہو جائے۔ تو کیا میرا سندیس نہ دو گے —— ؟ اگر تم سے نشانی مانگیں۔ تو یہ دکھا دینا ——" اور اس نے دو آنسو نالے میں ٹپکا دیئے ہونگے اُسے شاید ان دو قطروں کی اس طاقت کا علم نہ تھا۔ کہ وہ سارے کے سارے دریا کو مضطرب کر کے "کسی" کی کشتی کو ڈانوا ڈول کر سکتے ہیں۔

آہ وہ بھی کون سا دن تھا۔ جب میرے دوست اُس درّے میں مجھے اکیلا چھوڑ آئے۔ گوپال داس بار بار ہمت توڑ رہا تھا " بس بھائی میں تھک گیا ہوں۔ اب اور آگے نہیں "۔ اور مجھے سخت غصّہ آ رہا تھا۔ کہ یہ جنگل۔ یہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ۔ یہ بڑے بڑے پتھر جن سے سر ٹپکتا ہوا دودھیا پانی اتنے حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کہ اس پہاڑی نالے کا پاٹ کسی بڑے دریا سے کم نہ ہو گا۔ اور پھر ایسی فضا میں کوئی کہے کہ میں تھک گیا ہوں۔ اسکے لئے میرے پاس " تپدق کا مریض " سے بہتر کوئی خطاب نہ تھا۔ بالآخر ایک جگہ سب بیٹھ گئے لیکن میں پتھروں سے کھیلتا ہوا اور اُن پر سے پھاندتا ہوا دھیرے دھیرے نالے کو پار کرنے لگا۔ اچانک مڑ کر دیکھا۔ تو سب کے سب واپس لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ مرزا شفیع اس خلاف تہذیب طریقہ کے خلاف احتجاج کر رہا تھا لیکن وہ سب اُسے گھسیٹے جا رہے تھے " میاں۔ اُس پگلے شاعر کا کیا ٹھکانہ۔ جی چاہے۔ تو اُسی پتھر پر بیٹھا بیٹھا سانجھ کر دے "۔ آخر وہ چلے گئے لیکن نالے کی مختلف شاخوں نے میرے پاؤں میں کچھ ایسی زنجیر ڈالی کہ میں وہیں رہ گیا۔

—— رفتہ رفتہ پار ہوا۔ قریب ہی ایک پن چکی کی " گڑ گڑ " سنائی دے رہی تھی۔ میں تجسّس کے مارے اندر چلا گیا۔ چھوٹی سی مٹی کی جھونپڑی تھی۔ کسی کی موجودگی سے بے نیاز میں پانی کی گرتی ہوئی آبشار کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ اچانک نظر اٹھا کر چکی کی جانب دیکھا —— تو " اس " پر نظر پڑی۔ وہ اپنی نرگس ایسی آنکھوں سے ایک " پردیسی " کی جانب تک رہی تھی۔ ان آنکھوں سے خدا جانے شہد کی نہر بہہ رہی تھی۔ یا شراب [illegible] ——

بہر حال مجھے وقتی طور پر ایسا محسوس ہوا ۔ گویا جنت میں پہنچا دیا گیا ہوں میرے لیٹے پن چکی کا اور کچھ دیکھنا باقی نہ رہ گیا ۔ میں اس کے عین مقابل چکی کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا ۔ لکڑی کے ڈنڈوں کے ساتھ اس طرح لگ کر کہ اُس کے قریب تر ہو سکوں ۔ مجھے اس بات کا خیال تک نہ رہا ۔ کہ میرے چیسٹر پر آٹا لپٹ رہا ہے ۔ میں اس کے چہرہ پر نظریں گاڑے کھڑا رہا ۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں ۔ اور اپنے کپڑوں پر جما ہوا آٹا جھاڑنے لگ گئی ۔

خوش قسمتی سے وہاں کوئی دوسرا نہ تھا ۔ لیکن اگر ہوتا بھی ۔ تو اس وقت مجھے اس بات کا قطعاً کوئی دھیان نہ تھا ۔ میں اُس کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کی جانب دیکھے جا رہا تھا ۔ اور بس ——— اُس نے ایک بار نظریں اٹھا کر پھر میری جانب دیکھا ۔ لیکن مجھے اسطرح دیکھتے دیکھ کر پھر گردن جھکا لی ۔ آخر میرا خمار ٹوٹا ۔ میں نے پہل کرتے ہوئے پوچھا " یہ چکی تمہاری ہے " اس نے اسی طرح چکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " جی ——— " میں نے پھر اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھیں ۔ لیکن " جی " اور " ہاں " کے سوا کوئی جواب نہ ملا ۔ پھر میں نے پوچھا ——— " تمہارا نام کیا ہے " " صاہب " میں نے جھٹ فقرہ جوڑ دیا ——— " میم صاحب " اُس نے جلدی سے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا وہ اپنے ہونٹوں پر اس مزاح سے پیدا شدہ مسکراہٹ کو دبا نہ سکی ۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑا ——— وہ جھینپ گئی ۔ میں نے پھر پوچھا " شادی ہو چکی ہے " " ہاں ——— " " کوئی بچے ہیں ——— " " نہیں

——" میں کچھ سوچ میں پڑ گیا —— کیا یہ شادی شدہ حسینہ
ایک پردیسی سے رومان کا ناٹک کھیل سکتی ہے۔ نہیں —— تو پھر یہ
ہنسی کیوں ...... ؟ شاید عادتاً ہی ۔ لیکن نہیں ۔اس کی آنکھوں میں
کچھ وہ "جھلک رہا ہے ۔ایسا کیوں ...... ؟ اچھا تجربہ کر دیکھو" مجھے انسانی
نفسیات کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق ہے ۔کیونکہ میں اپنے افسانوں کی
بنیاد ہمیشہ مشاہدے پر رکھتا ہوں ۔ چنانچہ اس بار میں نے ایک شادی
شدہ لڑکی کے نفس کا مطالعہ کرنے کی غرض سے کچھ پیش قدمی کی ۔
چکی کا ایک پرزہ دیکھنے کے بہانے میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔اس نے
وہاں سے ہلنے کی کوشش نہیں کی ۔ہمت نے زور پکڑا ۔ میں نے اس کے
کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ۔اور پھٹے ہوئے لباس کے باعث نیم عریاں بازوؤں
اور شانوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا ۔ اس نے سر نیچے ڈال دیا ۔میرا ہاتھ
دراز تر ہوتا گیا ۔کہ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور آہستہ سے باہر جانے لگی ۔
میں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا ۔ لیکن اس نے آہستگی سے محض اتنا ہی
کہا —— "ٹھہرو ۔ میں آبشار کا پانی بند کر آؤں ——" میں نے
اسے راستہ دینے سے پہلے اس کے باریک باریک ہونٹوں پر اپنے
لب رکھ دیئے —— میں نے دیکھا ۔کہ اسکی آنکھیں جیسے مدھورس سے
لبریز ہو گئی ہیں ۔ اس کے انگ انگ کی اٹھان میں ایک بانکپن آ گیا ۔اسکی
کیفیت بیان سے باہر تھی ۔ گویا وہ ایک ندی تھی ۔جو ہوا کے کسی آوارہ
جھونکے سے مس کرتے ہی لہرا اٹھتی ہے ۔ اس کی سطح پر ایک تھرتھری پیدا

ہو جاتی ہے۔ اسی حالت میں میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور وہ باہر چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحہ میرے دل میں خیال اُٹھا۔ مبادا یہ کسی کو بُلا لائے ـــــ آہ۔ انسان بھی کس قدر بدگمان ہوتا ہے۔ میں اُس بوسیدہ تختے کی آڑ سے جسے دروازہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھتا رہا۔ حتٰی کہ وہ اسیطرح خاموشی سے واپس لوٹ آئی ـــــ چکی پر گرنے والی آبشار بند ہو چکی تھی۔

وہ اندر آئی۔ اور چپ چاپ سر جھکا کر جھونپڑی کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔ مجھے اسکے بوسیدہ لیکن ڈھیلے ڈھالے کشمیری فرن کے اندر سے بھی مختلف اعضاء کی پھڑک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ اور اُس نے اپنے تئیں میری گود میں ڈال دیا ....

میں نے اس کی مٹیالی لٹوں کو سلجھاتے ہوئے پوچھا "صاحب تمہیں میں اچھا لگا ـــــ" اس نے میرے سینے سے لگے لگے ہی میرے فاؤنٹین پن کے کلپ کو انگلی سے صاف کرتے ہوئے کہا ـــــ "میں کیا جانوں ـــــ"

اُف کیا بتاؤں۔ کہ اس جواب میں کس قدر معصومیت تھی۔ اتنی معصومیت سوتے بچّے کی مسکراہٹ میں بھی نہ ہوتی ہو گی۔ میں نے پھر پوچھا "تم بھاگ کیوں نہ گئیں؟"

"میں کیا جانوں ـــــ"

میرا جذبۂ تحقیق و تجسّس اور دعوئے زُہد اس معصوم "میں کیا جانوں"

میں ڈوب گئے۔ میں اسکے نفس کی شکست کا مطالعہ کرنے والا تھا۔ لیکن خود اپنی شکست کا سامان کرنے لگا۔ میں نے حسینوں کے جذبات سے کھیلنا سیکھا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اس کھیل میں کبھی کبھی خود بھی ہار ماننی پڑتی ہے اور اس روز کشمیر کی پہاڑیوں کے ایک سنسان درّے میں پھٹے کپڑوں والی ایک دیہاتی لڑکی نے ایک ہی بھولی ادا سے ایک کھلنڈرے پردیسی کو لوٹ لیا..........

بایں ہمہ اس طرح لٹ جانے پر بھی مجھے اتنا ہوش رہا۔ کہ ایک شادی شدہ عورت کی تشنگیٔ محبت کی وجہ جان سکوں۔ مجھے اُس نے بتایا کہ اُس کی شادی اس شخص سے ہوئی ہے۔ جو آج سے چار سال قبل اسکا پھوپھا تھا۔ اور کافی بوڑھا لیکن حیثیت دار ہے۔ اس تحقیق نے میرے اس عقیدہ کو اور بھی پختہ کر دیا۔ کہ "عورت بدکار نہیں ہوتی۔ اُسے دولت پرست سماج ہی ایسا بنا دیتا ہے"!

مجھے اپنے دوستوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس لئے میں اُس سے دوسرے روز آنے کا وعدہ کرکے چلا آیا۔ لیکن تمام راہ مجھے وہ لوگ نہ ملے۔ وہ کرپ میں پہنچ چکے تھے۔ اور میں بار بار سوچ رہا تھا۔ کہ کیا یہ سچ تھا مجھے اس واقعہ کی حقیقت پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ دوستوں سے بچھڑنے کے بعد چند ہی لمحوں میں کیا کچھ ہو گیا۔ یقیناً یہ ایک خواب تھا۔ ویسا ہی خواب جیسے دیکھنے کا میں عادی ہوں۔ حتیٰ کہ صبح ہونے ہوتے مجھے اس بات میں کوئی

شک نہ رہ گیا۔ کہ نالے میں کسی پتھر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ایک حسین خواب دیکھا تھا۔ لیکن پھر دل میں یہ کسک کیوں؟ اور میں خود اپنے آپ پر اس بات کے لئے ہنس پڑا۔ کہ خواب میں دیکھی ہوئی حسینہ کو دل دے دیا۔ یہ سب باتیں ہی تھیں۔ اور میں سانجھ کے لئے بے تاب تھا۔ خواہ یہ خواب ہی تھا۔ لیکن میں پھر وہیں جانا چاہتا تھا۔ جہاں صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

سانجھ ہوئی۔ اور میں پھر اُسی جھونپڑی میں تھا۔ آج اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کی وہی حالت ہو گئی۔ جو پورنماشی کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے۔ اسکے چہرے پر آج ایک بھی دھبہ نہ تھا۔ وہ شبنم سے دھوئی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح پاکیزہ تھا۔ اُس نے اپنے دیہاتی فیشن میں نہایت خوبصورتی سے چوٹی گندھوائی تھی۔ بالوں کا رنگ آج مٹیالا نہ تھا۔ بلکہ ان کی چمک سانپ کی آنکھوں کو مات کئے دیتی تھی۔ شاید تمام دن اس نے اپنے چہرے اور بالوں کی کڑی حفاظت کی تھی۔ اُس کا فرن وہی تھا لیکن اُس پر گرد کی موٹی تہ نہ تھی۔

آج چاند تو چودھویں کا تھا ضرور۔ لیکن راس اور ذنب نے اُسے گرہن لگا رکھا تھا۔ آج اسکے پاس دو بارہ بارہ سالہ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جو حیرت سے مجھے تک رہی تھیں۔ میں اسکی چکی کے قریب گیا۔ لیکن اس نے آنکھ تک اُٹھاکر میری جانب نہ دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ کہ یہ اُسی کی کوئی رشتہ دار ہونگی۔ میں ایک اجنبی کی طرح کچھ دیر اِدھر اُدھر کی چیزیں دیکھتا رہا۔ اس دوران

میں اس نے پہلے ایک لڑکی کو کسی بہانے باہر بھیجنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ گویا اس نے کہا۔ کہ "تمہیں معلوم نہیں۔ یہ پرایا مرد یہاں ہے۔ ہم تیری حفاظت کے لئے یہیں بیٹھیں گے ــــــ" اس نے سر جھٹک دیا۔ اور پھر اس نے کوئی "کوشش" نہ کی ــــــ گویا ایک نہایت نازک کلی پر اوس پڑ گئی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلا۔ اور نالے کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ کہ شاید باہر آئے۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ باہر تو نکلی۔ لیکن آٹے کی بوری سر پر اٹھائے ہوئے۔ یعنی وہ گھر واپس جا رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے کرتے اُس نے ایک لڑکی کو زور سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کہ "تم نے بہت تنگ کیا ہے۔ کل میں آؤں گی۔ تو تمہیں قطعاً ساتھ نہیں لاؤں گی"۔ گویا اس نے مجھے بالواسطہ طور پر "کل" کے لئے دعوت دی۔ لیکن ....

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ "اے معصوم حسینہ کاش تجھے معلوم ہوتا ـــ کہ تو کل جس کے انتظار میں صبح سے سانجھ کر دے گی۔ وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہو گا۔ تو سانجھ کو گھر لوٹتی ہوئی کہے گی۔ کہ "پردیسی کس کے میت"۔ لیکن کاش تو آج بات کرنے کا کوئی موقعہ پیدا کرتی۔ اور میں تجھے اپنی مجبوری بتاتا۔ گوپال داس کے گھر سے فوراً لوٹ آنے کا تار آ گیا ہے۔ ہم کل نہیں رک سکتے۔ اب بھی وقت ہے۔ راہ میں سے لوٹ آ۔ کوئی بہانہ کر کے۔ کہ میری فلاں شئے پن چکی پر رہ گئی ہے۔ لیکن افسوس۔ تو نے ابھی تک مکاری نہیں سیکھی ــــــ"

میں کتنی ہی دیر تک اس پہاڑی پر چڑھنے والی پگڈنڈی پر جاتی ہوئی تین مورتیں دیکھتا رہا۔ جن میں سے ایک بار بار رُک کر پیچھے کو مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اور تینوں کے مل کر اس مشہور پہاڑی گیت کو گانے کی آواز آ رہی تھی۔

دے لاجوا

کداں ملاں دے چندراں دے اوہلے۔ تناں بڑی ڈاہڈی۔
اے لاجو۔ میں تمہیں پن چکی کے پیچھے کس طرح ملوں۔
میری نند بڑی کایاں ہے۔

اور میرے لب پر یہ دوہا تھا۔

ندی ناؤ کا بیٹھنا ایک پلک کی پریت
پھر بچھڑے ناہیں ملیں صدیاں جائیں بیت

اور پھر یہ خواب بھی چپوؤں کی آواز میں کہیں گم ہو جاتا ہے——

"شڑاپ شڑ۔ شڑاپ شڑ۔ شڑاپ شڑ" وہ سامنے فتح کدل پل کے نقوش کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح دھندلے دکھائی دے رہے ہیں۔

گہرے اندھیرے میں سے پُل کی محرابیں ایک ایک کر کے اُجاگر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ عین اسیطرح جسطرح آج پانی کی اس خاموش روانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے میری زندگی کے وہ حسین اور سنہری لمحے باری باری

ماضی کی یاد کے اندھیرے میں سے اچانک ہو تے چلے جا رہے ہیں جنہیں میں زندگی کی چور کر دینے والی کلفتوں کا واحد خوشگوار ماحصل سمجھتا ہوں۔ وہ لمحے جب کسی دوپٹے کے خوبین رنگ نے ہمارے دل کو خون کر دیا۔ جب کسی کے مسکراتے ہوئے تیکھے لبوں نے ہمیں چرکہ لگا یا۔ جب کسی نے ہنستے ہنستے ہم سے دو باتیں کیں۔ اور ہمارے دامن کو سدا بہار پھولوں سے بھر دیا۔ یا جب کسی نے جھکی ہوئی شرمیلی آنکھوں سے کچھ اس طرح دیکھا۔ گویا ایک تیر نیم کش چھوڑا ہو۔ یعنی وہ چند لمحے جو ہمیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں۔ کہ جو رنگین خواب ہم نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ محض سراب نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی حقیقت کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ گو یہ لمحے انسان کی زندگی میں خال خال آتے ہیں۔ با ایں ہمہ انکا سلسلہ لا متناہی ہے۔ کیونکہ ایسے لمحے ہر ایک شخص کی زندگی کے طویل اندھیارے میں کہیں کہیں ایک ابدی روشنی کی مانند نور افشاں ہیں۔ چنانچہ ان رنگین روشنیوں کا سلسلہ بھی بہت دراز ہے۔ اس جہلم کی طرح۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جہلم تو بحیرہ عرب سے ملکر اپنی تکمیل کر لیتا ہے۔ لیکن ان رنگین خواب نما حقیقتوں کا بیان ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہے گا۔

فتح کدل کی محرابیں زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ اور مجھے وہ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جس کی تشبیہ اس پازیب کی جھنکار سے دی جا سکتی ہے جو پردے کے پیچھے کسی حسینہ کے نازک پاؤں میں چھنک رہی ہو۔ جسکی محض آواز ہی سے

اس کی نازخرامی اور چال کی لٹک کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

میرا کیمپ ایک پہاڑ کی چوٹی پر لگا ہوا تھا۔ اسجگہ دو ہی چار کیمپ اور تھے۔ ایک میں ایک اینگلو انڈین عورت تھی۔ جس کا نام تو تھا "للی"۔ لیکن شکل نرگس ایسی نہ تھی۔ گویا ایسی ہی بات تھی۔ جسطرح ہم "سیاہی" کو روشنائی کہتے ہیں۔ اردو میں اُسے کافی مہارت تھی۔ بلکہ ادب سے بھی کچھ کچھ لگاؤ تھا۔ بدیں وجہ ہماری میل ملاقات بھی تھی۔ وہ مجھ سے کتابیں بھی پڑھنے کے لئے لے جاتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا۔ کہ آپ کا فلاں ڈراما اُس کیمپ میں رہنے والی لڑکی لے گئی ہے۔ دو ایک دن میں مل جائیگا۔ میں نے کہہ دیا "کوئی ہرج نہیں"۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو نہیں تھا۔ لیکن جانتا ضرور تھا۔ وہ ہند سرکار کے کسی بہت بڑے افسر کی نورچشم تھی۔ اور تفریح کی غرض سے وہاں آئی تھی۔ میں عموماً ان کے کیمپ کے پچھواڑے ہی صبح شام ٹہلنے جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں سے دور نیچے تک وادی کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز میں وہاں ٹہل رہا تھا۔ کہ کیمپ سے ایک ماما نکلی۔ اور میرے قریب آکر بولی "بابوجی یہ کتاب آپ کی ہے ـــــــ" "جی ہاں ـــــــ" "تو بی بی جی کہتی ہیں۔ کہ ہم اسے ایک دو روز تک اپنے پاس رکھ سکتی ہیں"۔ میں نے رسمی طور پر کہہ دیا ـــــــ "بڑے شوق سے۔ بلکہ اگر انہیں شوق ہو تو میرے پاس اور بھی کتب ہیں"۔

ماما دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اور میں یہ سوچتا رہ گیا۔ کہ "آخر یہ معاملہ

کیا ہے۔ مجھ سے" بی بی جی "کو پوچھنے کی ضرورت کیوں ؟ میں نے بلی سے کب تقاضا کیا تھا" مجھے دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا۔ اور اس وقت تو مجھے کوئی شک نہ رہا۔ جب وہ کتاب واپس آئی۔ اس میں ایک پرچہ اُن کے دستِ مبارک سے لکھا ہُوا پڑا تھا ——— "میں نے آپ کی کتاب کو ایک بھی داغ نہیں لگنے دیا۔ کیوں۔ ہے نہ ———" اس جانب سے اس ہلکی سی شوخی نے میری ہمت بڑھائی۔

دوسرے ہی روز ماما کے ذریعہ مزید کتب کا مطالبہ آیا۔ میں نے اپنے ہی افسانوں کی ایک کتاب بھیجدی۔ جس کے ساتھ ایک نامہ بھی تھا جس میں اُن کی پہلی مہربانی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اور اس کتاب پر تنقید کرنے کو کہا تھا۔

جواب میں انہوں نے لکھا۔ "میں ادبی دنیا سے ناواقف ہوں اور تنقید سے قاصر۔ علاوہ ازیں میں مذاحیہ کی دلدادہ ہوں۔ لیکن آپ کی یہ کوشش ہے۔ کہ آپ کے افسانے پڑھ کر کوئی بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ بہرحال میں اس بات سے خوش ہوں۔ کہ آپ دوسرے افسانہ نگاروں کی مانند اظہارِ محبت کے واہیات منظر پیش نہیں کرتے"۔

میں نے جواب دیا "آپ کا تنقید سے گریز واجب نہیں۔ ادبی دنیا سے آپ کی بے تعلقی میرے حق پر دال ہے۔ کیونکہ ادبی دنیا سے واقف لوگ بعض مرتبہ افسانہ نگار کے نام ہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

یا پھر منہ دیکھے کی ستائش ہوتی ہے۔ اور یہاں تو میں بدقسمتی سے اس رُخ لیسِ پردہ سے قطعاً ناآشنا ہوں۔ اس لئے آپ کی تنقید بے لاگ ہوگی۔ اور مجھے اپنی حقیقی پوزیشن کا تعین کرنے میں آسانی رہے گی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں۔ کہ میرا اپنا معیار یہ ہے۔ کہ ایک افسانہ پڑھنے کے بعد کم از کم چند ساعت تک تو آپ میں یہ سکت باقی نہ رہے۔ کہ آپ ورق پلٹ کر اگلا مضمون شروع کر دیں۔ آپ کی زبان سے بے ساختہ "آہ" یا "واہ" نکلجائے۔ ٹریجیڈی ہو تو آپ ایک لمبی سانس کھینچکر رہ جائیں ——— تو سمجھ لیجئے۔ کہ افسانہ نگار کامیاب ہے۔ اس کا مقصد اسی وقت پورا ہو جاتا ہے"

ماما کے ہاتھ جواب پہنچا ——— "ہم نے افسانہ نگار کے نام سے رعب تو کھا لیا۔ لیکن پھر بھی میں آپ کے منہ دیکھے کی ستائش تک نہ کر سکوں گی۔ ہاں۔ آپ کے افسانے پڑھ کر میں نے لمبی سانس تو کھینچی تھی۔ منہ سے آہ بھی نکلی تھی۔ شاید مجبوراً ہی ایسا ہؤا ہو"

میں نے جواب لکھا ——— "میرا مکھڑا کون سا چاند کا ٹکڑا ہے جسے دیکھ کر کوئی لازماً میری ستائش ہی کرے۔ اور یوں بھی نہ ستائش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا۔ رہا افسانہ نگار کے نام سے رعب کھانا۔ سو شاید اسی رعب کے مارے آپ کو آج تک اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں پڑی"

میرے طعنے کے جواب میں انہوں نے اپنا رُخ روشن تو نہ دکھایا! البتہ جواب بھیجا کہ "میں کل واپس بمبئی جا رہی ہوں۔ دل میں یہ تمنّا ہی رہے گی۔ آپ کے تازہ ترین افسانے نہ پڑھے۔ اس لئے اپنا ڈاک کا پتہ لکھ بھیجئے تاکہ میں سے منگوا سکوں۔"

اور ہمارا یہ رومان پس پردہ ہی رہا۔ اور اسی صورت میں اب تک چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ بعض دفعہ تو میں یہ سوچتا ہوں۔ کہ اسے رومان کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں کیا جانے کہ وہ کھلنڈری لڑکی بھی میری ہی طرح مردوں کے جذبات سے کھیلنے میں لطف پاتی ہو۔ تو گویا ہم دونوں آج تک ایک دوسرے سے کھیل رہے ہیں۔ کس قدر دلکش ہے یہ کھیل۔ اور اس پر لطف مستزاد یہ۔ کہ آج تک میں پردہ کے پیچھے ہی سے اُس پازیب کی جھنکار سن رہا ہوں ——
—— اور یہ خواب بھی تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتا ہے۔

چپّو اب بھی اُسی طرح چل رہے ہیں۔ شڑاپ شڑ۔ شڑاپ شڑ۔ شڑاپ شڑ" ملاح کے دل سے شاید اب وہ رومانی کیفیت دور ہو گئی ہے۔ جو کچھ دیر پہلے اس پر طاری تھی۔ اب اُسے اپنے گاہک کا خیال آیا ہے۔ اور وہ مجھے "پردیسی" سمجھتا ہوا کہہ رہا ہے —— "بابو جی۔ یہ شاہ ہمدان کی مسجد آج سے چھ سو سال پہلے کی تعمیر ہے ——" لیکن اندھیرے میں مجھے کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی۔

جہلم کی خاموش روانی اور میرے خواب —— دونوں جاری ہیں

——— اچانک شکارہ کنارہ سے ٹکراتا ہے۔ ملّاح کہہ رہا ہے: "لیجئے بابوجی زینہ کدل کا پل آگیا۔" کنارے والے مکان کے باہر روشن قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں "دینانا تھ چوپڑا اینڈ برادرز" چمک رہا ہے۔ اور میں اب بھی سوچ رہا ہوں۔ کہ "اس دار الخلافہ کشمیر سے ساٹھ میل دور اس کونے میں پہاڑیوں کے درمیان جو نالہ بہتا ہے۔ اسکے کنارے ایک پن چکی میں بیٹھی ہوئی ایک الھڑ دیہاتی حسینہ کیا اب بھی ایک "پردیسی" کی منتظر ہے؟ اور کیا ابھی تک اس کی زندگی کا ایک رومانی افسانہ "تشنۂ تکمیل" ہے ———؟

سری نگر نومبر ۱۹۴۱ء

"دفتر میں کام کے اوقات کیا ہوں گے۔؟"

"صبح نو بجے سے چھ بجے شام تک۔"

ایک سال پہلے کا اپنا سوال اور ریلوے بہادر کا وہ جواب اسکے کانوں میں اسطرح گونج رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کہا گیا ہو۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دفتر کی کلاک کی طرف دیکھا جس نے ابھی ٹن ٹن کر کے سات بجائے تھے۔ کلاک بدستور چل رہا تھا۔ سات بجا کر رُک نہیں گیا تھا۔ پھر وہ ——— کیوں رُک جائے۔ اور پیشتر اس سے کہ اسکی نظریں سوس کلاک سے میز پر منتقل ہوتیں۔ اسکا قلم دوات سے سیاہی لیکر سامنے پڑی فائل کے کھلے صفحے پر چلنے لگا۔

کلاک کی ایک آواز نے شنکر میں جو مستعدی پیدا کر دی تھی۔ دوسری آواز نے اُسے فنا کر دیا۔ ساڑھے سات بجے کی "ٹن" ہوئی۔ اور شنکر کا قلم پھر رُک گیا۔

اس نے نوجوانی ہی میں نیم سفید ہو جانے والا سر اُٹھا کر نہ رُکنے والے کلاک کی جانب اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذوں اور فائیلوں کے انبار کی جانب دیکھا۔ ابھی بہت کام باقی تھا۔ لیکن یہ ختم کب ہو گا؟ بیرائے بہادر کے دفتر کا کام۔ جو انکے کرایہ داروں سے کرائے وصول کرنے کے لئے مقدمے لڑنے سے لے کر گھر میں آنے والے اُپلوں کو گننے تک پھیلا ہوا تھا۔

آج اُسے چند دوستوں کے ساتھ سات بجے سینما دیکھنے جانا تھا۔ لیکن یہ کام ——————

اس کی گہرے بھورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں میں سُرخی پھیل گئی اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کرسی کی پشت پر اپنا بوجھ ڈال کر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

لیکن کلاک نہیں رُکا تھا۔ اور اس کا کام . . . .

دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اُن کے آخری قہقہے نے دُور اُفق پر ایک سُرخ رنگ کے چمکتے ہوئے بادل کی صورت اختیار کر لی۔ باہر سڑک پر سیر کرنے والے دوستوں کی ٹولیاں اور اُنکے قہقہے۔ موٹروں اور ٹانگوں کے شور و شغب تھا

ہیں ایک گونج پیدا کر رہے تھے۔ اور اس شور کے اوپر ہی اوپر تیرتی ہوئی وہ باجوں کی سُریلی آواز ——— شاید کسی نئے فلم کی اشتہار بازی کے لئے جلوس نکالا گیا تھا۔ یا کوئی برات جا رہی تھی۔ کتنی مسرور ہے دنیا۔ لیکن رائے بہادر کا کلرک ———

آخر اس کا کام کب ختم ہو گا"؟

رات کے اندھیرے نے آدھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابھی تک نیچے سڑک پر سے کسی اکے دکے راہ گیر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کی کوئی قہقہہ زا منڈلی بھی گذر جاتی۔ تو کیا ابھی تک دوستوں کی مجلسیں گرم ہیں اور اسکے اپنے دوستوں کی مجلس ؟ .... کیا وہ بھی ابھی تک کہیں بیٹھے ہوں گے ؟ .... لیکن اس کا کام .... ؟

یہ کب ختم ہو گا ؟ نہیں دوستوں کی مجلس کب کی بکھر چکی ہو گی۔ اب جلدی سے کیا فائدہ ——— ؟ کام ختم ہی کیوں نہ کر لیا جائے ....

لیکن یہ ختم کب ہو گا ؟

اور پھر ختم کیا ہی کیوں جائے۔ کیا کلرک کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ پینتیس روپے ماہانہ کی خاطر زندگی کی تمام رنگینیوں اور تمناؤں کو ان موٹے موٹے اور پھٹی ہوئی جلد والے رجسٹروں کو کالا کرنے میں گم کر دے۔

اُسے رائے بہادر کے ہاں نوکر ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ اور رائے بہادر کا وہ اوقاتِ کار کے متعلق روزِ اوّل والا جواب ابھی تک ایک تعبیر تشنہ خواب تھا۔

اوّل تو کام ہی ساڑھے سات آٹھ بجے سے پہلے ختم نہ ہو پاتا ۔ اور اگر ہو بھی جائے۔ تو اتنی دیر میں رائے بہادر ٹینس کھیل کر واپس آ چکے ہوتے ۔ اور اپنی تکان اتارنے کے لئے محض اس غرض سے دفتر میں بیٹھ جاتے ۔ کہ انکے دو تین کلرک انکے سامنے نیم دائرے کی صورت دست بستہ کھڑے رہیں ۔ اور آنجناب اپنی بے معنی اور بد ذوقی کی حامل باتیں سناتے رہیں ۔

رائے بہادر شاید اسی میں راحت محسوس کرتے تھے ۔ کہ جب تک وہ رات کا کھانا کھا کر بستر پر دراز نہ ہو جائیں ۔ انکے کلرک دفتر کی رونق بڑھاتے رہیں شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ملاقاتی کسی وقت بھی آجائے ۔ تو اُس پر رائے بہادر کی عظمت کا ویسا ہی اثر پڑے جیسا بیلی رام برادرز کی ۲۴ گھنٹہ سروس کا اُنکے گاہکوں پر ۔ انکے دل میں کئی بار یہ خیال آیا تھا ۔ کہ کلرکوں کے ہوتے رات کو چوکیدار کی کیا ضرورت ہے ۔ لیکن کلرکوں کو ناجائز تکلیف دینے کے خلاف اُنکا ضمیر بغاوت کر دیتا تھا ۔ جہاں ناجائز تکلیف دینا انہیں گوارا نہ تھا وہاں انہیں ناجائز رعایت دینا بھی پسند نہ تھا ۔ چنانچہ ان کے ہاں ہفتہ وار ۔ ماہوار ۔ یا سالانہ تعطیل کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا ۔ ہاں اگر کلرک کا کوئی قریبی رشتہ دار مر جائے ۔ تو رائے بہادر اپنا اصول توڑ لینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے ۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے شنکر کی آنکھوں کے سامنے رائے بہادر کی شکل پھر گئی .... ایک مکروہ شکل .... جس پر حرص و طمع کی سیاہی اُمڈ رہی ہوتی تھی ۔ جس کے قہقہے کی آواز کئی مفلسوں کی سوکھی ہڈیوں کے چرچرانے سے مرکب

تھی۔ جس کے گاؤں کی سُرخی اس کے کاشتکاروں کی آنکھوں سے بہنے والے خون سے مستعار تھی۔

جس کی پیشانی پر انسانیت کا ایک بھی خط نہ تھا۔ لیکن جسے خدا کی ایک لغزش نے سینکڑوں انسانوں کا مرجع بنا رکھا تھا۔

انسانیت........! انسانیت کے لئے رحم و انصاف لازمی ہیں اور وہ ان سے کورا ہے۔ اسی لئے..........

لیکن کیا ہم میں انسانیت ہے۔؟

انسانیت کبھی شیطنت کے آگے سر خم نہیں کرتی۔ پھر ہم........

ہم جو دن میں کئی کئی مرتبہ اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ کیا ہم انسان ہیں؟ جو اسکے ہر روا و ناروا کو چپ چاپ برداشت کرتے ہیں۔ ہم سے وہ بہتر ہے۔ اگر شیطان ہی ہے۔ تو بھی ایک فاتح ہے۔

تڑاخ....... شنکر کے ہاتھ میں قلم جانے کس جوش کے زیر اثر ٹوٹ چکا تھا۔

شنکر کے سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے بوڑھے امین چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی۔ ناک کی گھوڑی سے ایک لمحہ کے لئے اُٹھا کر اس چھوکرے کی جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھ کر کہا۔ شنکر کیا سوچ رہے ہو؟ تمہارا کام کب ختم ہو گا؟"

اس نے بڈھے کی جانب دیکھا۔ جس کی بامعنی نگاہیں پکار پکار کر کہہ

بھی نہیں ۔

" چھوکرے۔ تم کس جھنجھٹ میں پھنس گئے ہو۔ یہاں اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہاں فاتح کا قانون ہی انسانیت اور انصاف کہلاتا ہے۔ یہ دنیا ہے...... حقائق کی، تمہاری شاعری اور تصورات کی نہیں —— تم شاعر مزاج ہو —— ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہی ——"

شنکر اُس نگاہ طنز کی تاب نہ لا سکا۔ اپنے سامنے پڑے کاغذوں سے نگہ ہٹا کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اور میز پہ پڑے ہوئے ہر کاغذ پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔

" تم شاعر مزاج ہو۔ احساسات کو زندہ رکھنے والے...... اور اس دنیا میں آئے ہو شاعری کرنے......... ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا" اُس نے سر دھن لیا آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

" رائے بہادر کا کلرک اور پھر اس قدر حساس ...... او۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو —— اُس نے کانوں میں بھی انگلیاں دے لیں۔

کیا ایک کلرک کے لئے حساس ہونا گناہ ہے۔ کیا اُسے ایک زندہ لاش بن جانا چاہیئے۔ ایک لاش جسے سہانی برساتوں کی گھنگھور اور سرمئی گھٹائیں، بسنت نے نیلے پیلے اور اُودے پتنگ، ہولی کی رنگ پاشیاں، کسی بڑے تیوہار کے دن بیوی بچوں کا میلہ دیکھنے پر اصرار۔ یہ سب کچھ جسے اُس دفتری قبر سے باہر نہ نکال سکے...... ایک لاش...... جس کا جسم تو زندہ ہو لیکن احساس مردہ ہو چکا ہو۔

میں ایسی کلرکی سے باز آیا۔ اگر شادی کی جائے۔ تو بیوی کو گھر کی چار دیواری میں حبس بیجا میں کیوں رکھا جائے؟ آخر نوکری کی غایت یہی ہے تاکہ خالی اوقات میں عیش سے زندگی بسر کی جائے۔ خالی اوقات ...... یہ خالی وقت کب ملے گا ...... ؟ آخر یہ کام کب ختم ہوگا؟

اس نے سامنے بیٹھے ہوئے امیں چند کی جانب دیکھا " وہ بوڑھا ہوچکا ہے۔ اُسے بیوی کے احساسات یا عیش سے کیا۔ لیکن بہاری لال تو ابھی پچیس سال سے زیادہ کا نہیں۔ اُس کی بیوی بھی خیر سے ابھی جوان ہی ہے۔ تو پھر اسکے احساس کو کیا ہوگیا ہے ـــــــ ؟"

اُس نے بہاری لال کی جانب دیکھا۔ جس نے نیلے رنگ کے رجسٹر کی خانہ پُری کرتے ہوئے اچانک سر اٹھایا۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کی جانب دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔ لیکن اس ایک ہی لمحے میں اسکی نگاہیں شنکر کو جواب دے گئیں۔

"تم کیا جانو؟ بھولے نوجوان ـــــــ ! تمہارے تصورات کی لہر ابھی تک دنیاوی حقیقت کی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوئی۔ ورنہ تم ایسا نہ سوچتے۔ ہمارے احساسات کی راکھ میں سے اب بھی کبھی بھولے بھٹکے کوئی شرارہ تڑپ اٹھتا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے دماغوں میں بھی زلزلے کے چند جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کی شدّت اُس گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ جو بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے خیال میں ہے ـــــــ لیکن تم خالی کیوں بیٹھے ہو۔ تمہارا کام کب ختم ہوگا ـــــــ ؟"

شنکر کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ سامنے فائیلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نیچے سڑک پر ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سے اسکی تیز رفتاری کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے گھر جانے کی جلدی ہے۔ شاید گھر بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے بچے تو اب تک سو چکے ہوں گے۔ اور کیا جانے بیوی بھی اونگھ رہی ہو۔ کھانا پروسنے کے لئے کئی مرتبہ سرپوش کھولا ہوگا۔ لیکن اس کا غاوند جلدی کیسے آ جائے۔ آخر دفتر دفتر ہی ہے۔ گو پیٹ پالنے ہی کے لئے دفتر جانا ہوتا ہے۔ لیکن دفتر کا کام —— اسکے مقابلہ پر پیٹ بھرنا مقدم نہیں ہو سکتا۔

بہاری لال کی بیوی بھی تو منتظر ہوگی ...... اور ...... میری ہونے والی بیوی ——

لیکن یہ کام کب ختم ہوگا ......؟ یہ رائے بہادر کے دفتر کا کام ——

دفتر سے باہر نکلتے وقت کوٹھی میں ایک موٹر داخل ہوئی شنکر نے دیکھنے کی کوشش کی کہ اسمیں کون بیٹھا ہے۔ لیکن سامنے کی تیز بتیوں نے نگاہ خیرہ کر دی تھی۔ شنکر پھاٹک پار کر رہا تھا۔ کہ کسی کے اونچی ایڑی والے بوٹوں کی "ٹھپ ٹھپ" گول کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔ اور ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا اسکے لبوں سے نکلنے والے گیت کے چند بول شنکر تک پہنچا گیا۔

"ندی کنارے کھڑی ہوں ساجن
تیرے ملن کی آس!!"

شنکر نے آواز پہچان لی۔ یہ رانی تھی۔ رائے بہادر کی چنچل لڑکی۔ شاید بینما دیکھ کر لوٹی تھی۔

کتنی حسین ہے وہ۔ اور باپ سے کس قدر مختلف۔ وہ ایک لیبل اور بڑی دوائی کی بوتل ہے تو یہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا پیمانہ جس میں شربت شراب کی صورت میں چھلک رہی ہے۔ اسمیں رحم اور انصاف کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے۔ .... حسین ہمیشہ رحمدل ہوتا ہے نا۔

اُس روز اس کے طلائی نیکلس کی کئی کڑیاں ریت میں گر گئی تھیں۔ شنکر نے نہایت محنت سے ایک ایک کر کے ڈھونڈ نکالیں اور پھر ایک دھاگے میں پرو کر باندھ بھی دیا۔ تو اس نے کس قدر تلطف آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا "منشی جی۔ آپ کتنے اچھے ہیں" اور پھر اسکی وہ مسکراہٹ ــــــ قریب ہی مونیا کے گملے میں ایک کلی چٹک پڑی تھی۔ رانی نے اسے توڑا۔ سونگھا اور بالوں میں لگا کر چلی گئی۔

اُسی طرح بے باکانہ ہنستی ہوئی۔ ان کے صحن میں لگے ہوئے تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ رانی ہنس رہی تھی۔ اُس نے سوچا وہ بھی اپنے آنگن میں پھولوں کا ایک پودا لگائے گا۔ اُس نے پہلے بھی ایک دو مرتبہ کمرہ سجانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر بار ماں یہی کہتی ہے "گھر کی سجاوٹ تو تیری بہو آنے پر ہی ہو سکے گی"۔ اور بہو لانے سے وہ ہمیشہ انکاری رہا ہے جب اپنا پیٹ بھرنے کی ابھی کوئی اچھی سبیل نہیں۔ تو بہو لانا کیا معنی؟ رائے بہادر کی نوکری کا کیا بھروسہ۔ پرائیویٹ ملازمت ٹھہری۔ اور پھر اُس جیسے بدسیرت

مالک کی نوکری .... نہیں وہ یہ ملازمت نہیں کریگا۔ یہاں اس کے تصورات کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی ....» لیکن آج رانی نے اس کا خیال پھر بدل دیا۔ اس نے مجھے آپ کہہ کر بلایا ہے۔ "آپ —— کتنی خوش سیرت ہے وہ۔ اس کی پیشانی باپ کی طرح شکن آلود نہیں۔ اس کے مسکراہٹ میں کھلے ہوئے لب شاید غصہ کے مارے پھڑکنا نہیں جانتے —— وہ صرف مسکرانا جانتے ہیں .... اور پھر اُن کے صحن میں کھلے ہوئے پھول۔

یقیناً اس کوٹھی میں حسین اور رحمدل انسان بھی رہتے ہیں جو کلرکوں کو "آپ" کہہ کر بھی پکار سکتے ہیں۔ اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر سکتے ہیں۔ اس کوٹھی میں اچھے آدمی بھی بستے ہیں مسکراتے چہروں والے۔ اور پھر کوٹھی کے صحن میں کھلے ہوئے پھول ——

.... وہ بھی اپنے آنگن کے لئے ضرور شگفتہ پھولوں کا ایک پودا لائے گا۔

چند ہی روز کے بعد وہ کہیں سے گلاب کی ایک قلم لے آیا۔ انہی دنوں اس کی ماں نے شنکر کے لئے ایک خوبصورت لڑکی کا رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ منگنی ہو گئی۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ شنکر نے گلاب کی جو قلم لگائی تھی۔ اس میں ایک کونپل پھوٹ پڑی تھی۔

اچانک شنکر کو ٹھوکر لگی۔ اسکے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے موتی

محل سینما میں روشنیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ اُسے پھر بہت دیر ہو جانے کا احساس ہوا۔ اسکی بوڑھی ماں کو کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔ جو بیٹے کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ ایسی ملازمت بھی کیا ہوئی۔

سامنے سینما کے باہر ایک انگوری رنگ کی کار کھڑی تھی جسمیں ایک ڈرائیور بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ آخر یہ بیچارا بھی تو ملازمت ہی کرتا ہے نا؟ اسکی زندگی کلرک سے بھی بدتر ہے۔ کیا جانے اسے کب چھٹی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ مالک سینما سے نکلے تو کسی شراب خانے میں جا بیٹھے۔ اس بیچارے کی بھی بیوی ہو گی۔ وہ تو یقیناً انتظار نہیں کرتی ہو گی۔ کیونکہ انتہا میں سکون ہوتا ہے لیکن یہ تو لالہ کشوری لال کی کار ہے۔ سُنا ہے کہ اُسے سرمایہ داری کی نخوت چھو تک نہیں گئی۔ اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہو گا۔ آخر سرمایہ داروں میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ یہ ضرور خوبصورت ہو گا جبھی اچھی سیرت رکھتا ہے۔ رانی بھی تو خوبصورت ہے نا؟ .... وہ مسکراتا ہوا چہرہ اور اسکے صحن میں وہ کھلے ہوئے پھول۔ میرے پردے کی کونپل بھی اب کلی بن چکی ہو گی۔ بس پہلے ہی دن اُسے دیکھا تھا۔ جب وہ پھوٹ رہی تھی۔ ادھر کئی دن سے دفتر جلدی ہی جانا ہوتا ہے۔ اور دیر سے آنا پڑتا ہے۔ اسے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ رانی کو بھی تو اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا۔ وہ اُس روز مسکرائے ہی جا رہی تھی۔ شاید وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔ کیا اسلئے کہ اسکے صحن میں پھول ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ دفتر کے کلرکوں کی ابتر حالت دیکھے کیا پھر بھی اسیطرح مسکراتی رہے۔ لیکن نہیں اُس سے یہ توقع فضول ہے

ابھی کل ہی رُلدو رسوئیا سنا رہا تھا۔ کہ چھوٹی بی بی نے اُسے بُرنٹ مارا۔ وہ بوڑھا بیچارا —— وہ کہتا ہے۔ اُسے کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ تو کیا وہ صرف نوجوانوں ہی سے مسکرا کر باتیں کرتی ہے۔ اور "آپ" کہہ کر بلاتی ہے۔ پھر اُسے کیا سمجھا جائے۔ انصاف پروری یا نفس پروری ....

شنکر کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ سینما کی چکا چوند روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے میونسپلٹی کی مہربانی سے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

بوڑھے امیں چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جسکی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی۔ ناک کی گھوڑی سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اُس کی جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھ کر کہا۔

"شنکر۔ تم ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ رائے بہادر نے تمہیں جو برطرف کر دیا ہے۔ تو انکی مراد درحقیقت یہ نہیں۔ بلکہ وہ تمہیں مایوسی کے ڈراؤنے اندھیرے میں دھکیل کر اس بات کا احساس کرا دینا چاہتے ہیں کہ ایسی غلطیوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے تاکہ تم آئندہ غلطی کے خوف سے لرزتے رہو۔ جاؤ دو تین مرتبہ گڑگڑاؤ گے۔ تو ڈانٹ ڈپٹ ہی میں معاملہ نپٹ جائیگا۔

جاؤ ۔ اسی وقت جاؤ ۔ وہ اندر ہیں ۔ وہاں جاکر گڑگڑاؤ ۔ عورتوں کا دل جلدی پسیج جاتا ہے ۔ شاید تمہاری سفارش ہو جائے گی ۔"

شنکر نے سر جھکا لیا ۔" عورتیں سفارش کر دیں گی ۔ وہاں رانی بھی تو ہو گی ۔ وہ یقیناً اسے بچا لے گی ۔ آخر غلطی ہی تو ہو گئی ہے ۔ اسے سنگین غلطی کہنے سے کیا حاصل ؟ سنگین یا معمولی کی تخفیص تو جب ہو اگر وہ جان بوجھ کر کی گئی ہو غلطی محض غلطی ہی ہے ۔"

شنکر صحن میں داخل ہو چکا تھا ۔ سامنے ہی رانی کھڑی تھی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ ایک خوبرو جوان نفیس سوٹ زیب تن کئے ۔ باتیں کر رہا تھا دونوں کی آنکھوں میں ایک چمک تھی ۔ جو کسی خاص وجہ سے پیدا ہوا کرتی ہے ۔

شنکر ایک لمحہ کے لئے رُکا ۔" یہ تو یہاں کھڑی ہے ۔ وہاں میری سفارش کون کرے گا ۔ کیا یہ اندر نہیں آسکتی ۔ اس خوبرو جوان کو چھوڑ کر ——— لیکن ......" شنکر سوچتا جا رہا تھا ۔ لیکن رُکا نہیں ۔ برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ رانی کی آواز سنائی دی ۔

" کہاں جا رہے ہو ——— ؟"

" رائے بہادر کے پاس ———"

" کیا کام ہے ——— ؟"

شنکر نے کوئی جواب نہیں دیا ۔" وہ کیا بتائے ۔ کیا کام ہے ۔ اے چنچل حسینہ تو اس وقت اکیلی ہوتی ۔ تو شاید بتا بھی دیتا ۔ تجھے نفس پروری سے فرصت نہیں ۔ تو انصاف پروری کیا کرے گی ۔"

رانی نے کرخت آواز میں پھر پوچھا ۔

" کیا کام ہے ——— ؟"

" کچھ تھوڑا سا ——— "

" کچھ تھوڑا سا کے لگتے۔ تمہیں پتہ نہیں۔ کہ یہ وقت انکے آرام کرنے کا ہے۔ انہیں تھوڑی دیر تو چین کی سانس لینے دیا کرو۔ چلے آتے ہو منہ اٹھائے ——— "

شنکر نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ واپس آگیا۔ ایک سفید رنگ کا خوشنما پھول آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ اُس نے اُسے توڑ لیا! اور پھر مسل کے پھینک دیا اس میں اُسے کسی کے خون کی رنگت دکھائی دے رہی تھی۔ سفید ——— خوشنما ——— اسکے قریب برآمدے سے رانی اور وہ نوجوان ہنستے ہوئے گذر گئے۔ صحن میں لگے ہوئے پھول کھلے ہوئے تھے۔

پرلی کیاری میں مالی مرجھائے ہوئے پھولوں کے پودے اُکھاڑ اُکھاڑ کر باہر پھینک رہا تھا۔ شنکر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

" وہ اب معافی مانگنے نہیں آئیگا۔ نہیں۔ وہ اب یہ ملازمت نہیں کریگا۔ ایسے بدسیرت مالک کی نوکری۔ جس میں انسانیت نام کو نہیں یہیں یہاں اسکا جذبۂ انسانیت بغاوت کرتا ہے۔ یہاں اسکے تصورات کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔ وہ کچھ اور کرے گا۔ اگر ملازمت ہی کرنا ہے۔ تو کسی اور جگہ ڈھونڈ لیگا سرمایہ داروں میں کئی اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ لالہ کشوری لال بھی تو سرمایہ دار ہے۔

"آداب عرض ——"

"آداب عرض —— بھئی۔ کہو مزاج اچھے ہیں۔ کیا دفتر سے آ رہے ہو؟"
ششنکر نے چونک کر جواب دیا۔

"کون سا دفتر ——"

ششنکر نے حیران ہوکر پوچھا "کیسی بات کرتے ہو؟"

"ہاں بھائی۔ مجھے لالہ کشوری لال نے برطرف کر دیا ہے!"

"برطرف —— ؟" ششنکر کی آواز رک گئی "برطرف کس لئے کر دیا ہے —— ؟"

"ارے بھائی سرمایہ داروں کی کیا پوچھتے ہو۔ انہیں وجہ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیوی کے گاؤں کا کوئی لڑکا آیا تھا۔ اُسے ملازم رکھنا تھا مجھے نکال دیا —— اچھا۔ مجھے۔ ذرا جلدی ہے —— آداب عرض ——"

ششنکر کتنی ہی دیر تک وہاں سے ہل نہ سکا۔ کشوری لال نے برطرف کر دیا۔ یہی رام لال کسی روز اسکے گُن گاتا نہیں تھکتا تھا۔ بھولا پنچھی۔ یہ نہیں جانتا کہ شکاری خواہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔ وہ ہر حال میں شکاری ہے۔

سرمایہ داری نام ہے خون کے سفید ہو جانے کا —— اسکی انگلیاں کچھ ایسی حرکت کر رہی تھیں۔ جیسے کسی سفید پھول کو مسل رہی ہوں۔

ہارن کی آواز نے اُسے دہلا دیا۔ چوک کے عین درمیان وہ کھڑا تھا۔ اور اُس سے چند قدم کے فاصلے پر کسی کی لینڈ و بادشاہی کار "گھرر۔ گھرر" کر رہی تھی پھر زور سے ہارن بجا۔ ششنکر نے اس جانب دیکھا ۱۹۳۸ء ماڈل کی بیوک کے پھیلے ہوئے جبڑے اور جائینٹ ٹائر غصے سے کانپتے ہوئے پکار رہے تھے۔

"ہماری راہ سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو کچلے جاؤ گے۔" ایک بار تو اس کی انسانیت بغاوت کرنے پر تل گئی۔ اُس نے چاہا کہ اپنی انسانیت کو اس انسانیت سے عاری موٹر سے ٹکرا دے۔ اگر اسکی انسانیت اُس پر غالب نہ آسکے۔ تو ایسی انسانیت کا فنا ہو جانا ہی لازمی ہے۔ لیکن اسکی ماں .... وہ بوڑھی ماں جو اسکے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ اور ...... اسکی منگیتر جسے اسکے گھر کی سجاوٹ کرنی ہے"

وہ راہ میں سے ہٹ گیا۔ موٹر فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔

موٹر کے سامنے سفید خوشنما پھولوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ گویا وہ تمام سفید پھول اسکے ہاتھوں میں آ گئے ہیں۔ وہ اسکی انگلیاں ایسی حرکت کرنے لگیں۔ جیسے وہ ایک ایک خوشنما پنکھڑی کو مسل ڈالیں گی ......

لاہور۔ فروری ۱۹۳۹ء

جاہل

ہر ایک کی رائے اسکے متعلق مختلف تھی۔ چند ایک کا خیال تھا۔ کہ وہ اول درجہ
کا کوئی "لچہ" لفنگا ہے۔ چند ایک کا کہنا تھا۔ کہ "لچہ لفنگا" کہنا تو خیر زیادتی ہے۔ البتہ
رند مشرب شخص ہے۔ جس کا کوئی "آگا پیچھا گھر گھاٹ ہے نہیں"۔ بہرحال یہ
بات بالکل واضح تھی۔ کہ وہ انتہا درجہ کا بے فکرا شخص تھا۔ اور ایسا جان پڑتا تھا
کہ اُسے کبھی کسی غم سے واسطہ نہیں پڑا۔ اسکے جسم کی بناوٹ بھی کچھ عجیب قسم کی
تھی۔ مضبوط جبڑے ایک آہنی عزم ظاہر کرتے تھے۔ اور عقابی ناک اُسے زیادہ
ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ لیکن اسکے خلاف اسکی آنکھوں میں کرختگی کا نام و نشان
تک نہ تھا۔ اسکی نگاہوں میں جیسے شیرینی تھی۔ اسکی ہر وقت ڈبڈبائی سی رہنے
والی آنکھوں کے آگے پانی کی ایک ہلکی سی اوٹ ہوتی۔ جسکے پیچھے سے ان میں

مظلومیت کا رنگ جھلکتا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تھیں۔ جو اس ظاہری شکل سے پیدا ہونے والی کرختگی اور ہیبت کو ایک حد تک ملائم کر دیتی تھیں۔ یا پھر اسکی چال جس میں ٹانگوں کی مضبوط گٹھن کے باوجود لڑکھڑاہٹ یہ ظاہر کر رہی تھی۔ کہ یہ شخص اس مسافر کی طرح ایک غیر یقینی استقلال رکھتا ہے۔ جسے اپنی منزل کا رُخ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو۔ اور جو محض چلنے جانے کی خاطر ڈگمگاتے قدم اٹھاتا ہؤا چلا جاتا ہے۔

وہ اپنا نام کلیان بتاتا تھا۔ ایک بالکل اُجڈ شخص۔ جس سے ہسپتال کے تمام مریض اگر وحشت نہیں کرتے تھے۔ تو کم از کم ڈرتے ضرور رہتے تھے۔ یہی ہمہ وہ سائے ہسپتال کی رونق تھا۔ دوپہر کو جب مریض دھوپ کے لئے میدان میں جمع ہوتے تو وہ ایسی ایسی مزیدار باتیں کرتا۔ کہ حاضرین لوٹ پوٹ ہوتے جاتے۔ اسکی سب سے بڑی صفت یہ تھی۔ کہ جس کے پاس وہ ہوتا وہ کم از کم وقتی طور پر تو یہ بھول جاتا۔ کہ "میں تپ دق کا مریض ہوں۔ جس کے لئے موت کے سوا اور کوئی علاج نہیں"۔ اس دق کے ہسپتال میں جہاں موت کا عقاب ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ جس کے کھلے ہوئے پروں کا سایہ مریضوں پر کچھ اس طرح پڑا ہوتا ہے۔ کہ انکے سہمے ہوئے چہروں پر امید یا خوشی کی روشنی کا ہلکا سا نشان تک نہیں ہوتا۔ کلیان کی صحبت دم بھر کے لئے تو اُن کے چہروں سے یاس کی سیاہی دھو ڈالتی تھی۔ اور آفتاب زندگی غروب ہوتے وقت بھی انکے چہروں پر شفق کی سُرخی پھیلا جاتی۔ وہ چاہتے۔ کہ اسکی باتیں کبھی ختم نہ ہوں۔ اور سچ مچ وہ ختم ہوتی بھی نہ تھیں۔ گو اس کی زبان

شائستگی کے بجائے پھکڑ پن سے مملو ہوتی۔ لیکن دلچسپی کے لحاظ سے اسکی باتوں کا جواب نہ تھا۔

تمام دن اُس کا کام دیگر مریضوں کی طرح اپنے بستر پر لیٹنا نہ تھا بلکہ ہر ایک کے کمرہ میں جاتا۔ کہیں کم کہیں زیادہ وقت لگاتا حتیٰ کہ رات ہوتے ہوتے وہ سارے ہسپتال کا ایک چکر لگا چکا ہوتا۔ اُسے ایسے مریضوں کے پاس جانے میں بھی کوئی باک نہ ہوتا۔ جن سے دوسرے لوگ دس دس گز کی دوری پر رہتے۔ بلکہ ایسے خوفناک مریض۔ جن کے بار بار تھوکنے سے ان کے ارد گرد دس دس فٹ تک کی فضا میں جراثیم دق کا ایک ہجوم بے پناہ، جمع ہوتا کلیاں ایسے مریضوں کے پاس دوسروں کی نسبت زیادہ دیر بیٹھتا۔ گھنٹوں بیٹھا باتیں کرتا۔ ہنستا ہنساتا اور پھر دوسرے مریض کے کمرے میں چلا جاتا یہی اُس کا روزانہ معمول تھا۔

کئی مریض اُسے "خطرناک مریضوں" کے پاس اسطرح بیباکانہ جانے سے روکتے۔ تو وہ ــــــ محض ہنس دیتا۔ پھر وہ لوگ اسکے منہ پر ہی اُسے "جاہل" کہتے۔ اور وہ محض مسکرا دیتا۔ اسکی ان حرکتوں میں کسی بھی شخص کو رحمدلی کا شائبہ تک نظر نہ آتا۔ کیونکہ اُس جیسے ہیبت ناک شخص کے اندر بھی رحم یا درد کا جذبہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات ماننے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ بلکہ اسکی اس بیخوفی نے اُسے اُن ڈراؤنے شخصوں کی مانند۔ جو رات رات بھر مرگھٹ میں جلتی ہوئی لاشوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ اور زیادہ ڈراونا بنا دیا تھا۔

ایک رات وہ سویا ہوا تھا۔ کہ قریبی کمرہ سے ایک مریض کے کراہنے

کی آواز سنکر جاگ اُٹھا۔ ایک سنسان رات میں اور پھر تپ دق کے ہسپتال میں کسی مریض کی کہب آمیز آواز کچھ ایسی بھیانک ہوتی ہے۔ کہ کلیان ایسا وحشی صفت انسان بھی دہل گیا۔ کتنی ہی دیر تک اُسے اپنے بستر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے کوشش کی۔ کہ اپنا سر بھی لحاف میں چھپالے لیکن اسکے باوجود وہ آواز اسکے کانوں تک پہنچتی رہی۔ اس وقت اس پر متضاد جذبات چھائے ہوئے تھے۔ خوف گھبراہٹ۔ کچھ کچھ دلیری بھی۔ ملامتِ نفس بھی۔ اور سب سے زیادہ اس مریض کی چیخوں سے متاثر ہو کر خود چیخنے کا جذبہ بھی۔ اور جذبات کی اس جنگ نے اُسے اور بھی نڈھال کر دیا۔ وہ چاہنے پر بھی چارپائی سے اُٹھ نہ سکا۔

اتنے میں اس نے برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے قدموں کی چاپ فوراً پہچان لی۔ یہ رات والی نرس تھی۔ جس کے ذمہ رات کے وقت مریضوں کی خبرداری کا فرض سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن جس نے اپنی کرسی پر لیٹے لیٹے خراٹے بھرنے کے سوا کبھی کوئی کام نہ کیا تھا۔ یا پھر جب کبھی اُس کا کوئی "دوست" آجاتا۔ تو رات بھر اسکے ساتھ ملکر اپنے کمرے میں کچھ ایسا اودھم مچاتی۔ کہ مریض چونک پڑتے۔

بہرحال اسوقت تو اسکے قدموں کی آہٹ نے کلیان کو بہت کچھ سہارا دیا۔ جسطرح بچہ اندھیری سیڑھیوں میں نہایت ہراساں ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ جانور اسکی جانب منہ کھولے لپکتے ہیں۔ لیکن اسوقت اگر کوئی بڑا بوڑھا دور بیٹھا ہی اُسے آواز دیتا رہے۔ تو اسکا خوف بہت حد تک دور ہوجاتا ہے۔ اسمیں اندھیرا

راستہ طے کرنے کی سکت لوٹ آئی ہے۔ اسیطرح نرس کے بوٹوں کی چاپ نے کلیان میں اتنی ہمت پیدا کر دی۔ کہ اُس نے لحاف میں سے منہ باہر نکال لیا۔ اتنے میں نرس اُس مریض کے دروازہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے باہر سے کھڑے کھڑے ہی آواز دی "محمد و اسوقت کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے۔ دوسرے مریضوں کو بھی سونے دو گے یا نہیں"

اندر سے ایک ایسی آواز آئی۔ جیسے کوئی شخص ہانپ گیا ہو۔ محض اس نے اتنا ہی کہا "مس صاحب مرا ــــــ" اور اسکے بعد کھانسی کھانسی بھی اس قیامت کی کہ کتنی ہی دیر تک اسکا دم الٹا رہا۔ حتیٰ کہ کراہنے تک کی آواز آنی بند ہو گئی۔

نرس نے پھر وہیں سے حکم دیا "اچھا۔ اچھا۔ اسوقت خاموشی سے لیٹے رہو۔ صبح ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے ــــــ" اور پھر آگے بڑھ گئی۔

کلیان کے دروازہ کے سامنے سے گذری، تو اُس نے آواز دی "مس صاحب" اس نے چلتے چلتے آواز دی "چپکے سو رہو ــــــ" اس نے پھر آواز دی "ایک ضروری کام ہے ــــــ" نرس نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ اور دہلیز میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کیا ہے ــــــ؟" کلیان نے فہمائشی لہجہ میں کہا "اس بیچارے کو شاید بہت تکلیف ہے۔ آپ اندر جا کر تو دیکھا ہوتا ــــــ"

نرس نے ناک بھوں سکوڑ لیا۔ "ہوں۔ اندر جا کر ہم نے اپنی موت مول لینی ہے۔ وہ ختم ہو رہا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ ابھی خاموش ہو جائیگا ــــــ" نرس

نے یہ کہا۔ اور چلی گئی۔

کلیان کے گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انسانیت کے خون کو اس قدر سفید ہوگیا دیکھ اس میں اتنا جوش بھر گیا۔ جتنا باغیوں میں ہوتا ہے "گھبراؤ نہیں۔ ابھی خاموش ہو جائیگا" یہ فقرے اسکے کانوں میں پگھلے ہوئے شیشے کی مانند زخم کر گئے۔ وہ سوچنے لگا" تو گویا اس انسان کی زندگی ہی دوسرے انسانوں کی گھبراہٹ کا موجب ہے۔ جب اس پر خاموشی۔ ایک ابدی خاموشی طاری ہو جائے گی۔ تو سب۔ یہ نرس۔ یہ مریض۔ یہ انسان ——— سب کو چین کی نیند نصیب ہو جائے گی ———"

ان خیالات نے اسکے دل سے تمام ڈر تمام خوف دھو ڈالا۔ اور یہ گرد و غبار ہٹ جانے پر اسکی انسانیت پھر چمک اٹھی۔ اسے محمدو کے کمرہ میں موت کا فرشتہ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ بدھڑک اس کمرے میں چلا گیا۔ دیگر مریضوں کو اس کمرہ میں کلیان کے جانے کی آہٹ ملی۔ تو سب نے اپنے اپنے منہ میں یہی لفظ دہرایا ——— "جاہل ———"

محمدو دھونکنی کی طرح دھونک رہا تھا۔ اسکے پھیپھڑے بالکل خالی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس کا [illegible] کی طرح چل رہا تھا۔ بار بار اُسے کھانسی آتی تھی۔ اور اسکا دم اُکھڑ اُکھڑ جاتا تھا۔ کلیان اسکے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسکے سینہ کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ جس سے اسکی کھانسی قدرے بند ہوئی۔ محمدو نے خون سے بنا ہوا تھوک پھینکا۔ اور بدحال ہو کر پانی مانگا۔ کلیان بھاگا بھاگا

گیا۔ اور اپنے آبخورے میں پانی لے آیا۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر محمدو کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے بچوں کی طرح اپنا سر کلیان کی گود میں رکھ دیا۔ کلیان آہستہ آہستہ اُسے سہلانے لگا۔ محمدو سسکیاں بھرنے لگا۔ کلیان نے پوچھا۔
"کیوں محمدو۔ روتے کیوں ہو؟"

محمدو نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا "تو کیا میں مرجاؤنگا کلیان——؟"

کلیان نے پوچھا "کیا تم جینا چاہتے ہو؟ کس کے لئے؟ تمہارا کوئی ہے——؟"

"یہ دنیا تو ہے۔ اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا——" محمدو نے جواب دیتے ہوئے ایک لمبی سانس لینے کی کوشش کی۔ لیکن پھیپھڑوں میں اس قدر تناؤ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے بے بسی کے عالم میں سر پھینک دیا۔

کلیان اس کی بات سُنکر ہنس دیا۔ محمدو نے اُسے ہنستے دیکھ کر کہا "تم کتنے اچھے ہو کلیان۔ کتنے سکھی ہو۔ تمہیں کوئی دکھ نہیں——"

کلیان پھر ہنسا۔ اور کہنے لگا "تم نے کیسے سمجھا۔ کہ مجھے کوئی دُکھ نہیں؟"

"تم ہر وقت ہنستے جو رہتے ہو" محمدو نے جواب دیا۔

کلیان کہنے لگا "محمدو۔ کسی کے ہنسنے سے اسکی خوشی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ بلکہ جو بہت ہنستا ہے۔ اُسے سمجھو۔ کہ بہت زیادہ دکھ ہے جسے چھپانے کے لئے وہ اُتنا ہی زیادہ ہنستا ہے۔ جنکو دُکھی دیکھتا ہے۔ اُن کو ہنساتا پھرتا ہے۔

گویا اُنکے درد میں بھی حصّہ بٹا کر اپنے میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے ...." محمود کا سانس بہت جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اعضاء ایک ایک کر کے ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ لیکن دق کا مریض ہونے کے باعث اسکے حواس ابھی تک باطل نہیں ہوئے تھے وہ کلیان کی بات سُن رہا تھا۔ اور کلیان کہے جا رہا تھا۔

" تم جانتے ہو۔ کہ میں تمام دن کیوں مریضوں کے ساتھ ہنستا ہنساتا رہتا ہوں۔ تمہیں یہ تو معلوم ہے نہ۔ کہ دق کے مریض کی دلی کیفیت کیا ہوتی ہے جنہیں اس کا کچھ تھوڑا سا بھی علم ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ ایک بار یہ مرض لگ جانے کے بعد فرشتہ موت کے سوا اور کوئی اُسکا علاج نہ کر سکے گا۔ اُنکی ذہنی کیفیت اُس شخص سے کچھ بھی مختلف نہیں ہوتی۔ جسے یہ علم ہوتا ہے۔ کہ صبح مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ایسے شخص کے دماغ سے وقتی طور پر موت کا ڈراونا خیال ہٹا دینا اور اُسے ہنسا دینا ناممکن ہے۔ لیکن میں اسے ممکن کر دیتا ہوں۔ خصوصاً جب کوئی نیا نیا اس مرض میں پھنستا ہے۔ تو اسکی مایوسی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں ہر نئے آنے والے کی طرف سب سے زیادہ توجہ دیتا ہوں ——— اور جس قدر زیادہ مریضوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی قدر اُن سب کا درد سمٹ سمٹا کر میرے دل میں گھر کرتا چلا جاتا ہے "

محمود نے اپنی بکھرتی ہوئی طاقت کو آخری بار سمیٹ کر کہا " تم فرشتہ ہو۔ کلیان ——— "

" نہیں۔ ہم جاہل کہلاتے ہیں " کلیان نے اُسی لہجہ میں کہا " موجودہ دنیا کی انسانی تہذیب یہ ہے کہ مریض کو چھونا تو کیا۔ اسکے کمرہ میں بھی نہیں جانا۔

کیونکہ اس مریض کے جراثیم تم پر حملہ کر دیں گے۔ اُن سے کوئی پوچھے۔ کہ جب گھر بیٹھے بٹھائے یہ نامراد مرض چمٹ گیا۔ تو کس نے روک لیا۔ اور اب اگر موت آئی ہے۔ تو کون بچائے گا" کلیان پھر ہنس پڑا "انسانوں کی تہذیب میں سب کچھ ہے۔ صرف "انسانیت" ہی نہیں۔ کیا تم اسی مہذب دنیا کے لئے مرنا نہیں چاہتے۔ اس دنیا سے۔ اس تہذیب سے ایسی زندگی سے بغاوت کر دینی چاہیئے۔ اور زندگی سے بغاوت کا نام ہے موت ——— مر جاؤ ——— محمد و ——— مر جاؤ۔ باغی ہو جاؤ ———"

اُسے اپنے جذبات کے جوش میں یہ پتہ نہ چلا۔ کہ کب محمد واسی کی گود میں مر گیا۔ کلیان نے جب اُسے مردہ دیکھا۔ تو صرف ہنس دیا۔

دوسرے روز تمام مریض آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے "محمد کو اسی کلیان نے مارا ہے۔ اونچے اونچے چیخ رہا تھا" مر جاؤ۔ مر جاؤ۔ محمد و" اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ خدا جانے کیا کر دیا۔ جاہل کہیں کا"

ایک روز ڈاکٹر نے کلیان سے کہا "میاں۔ تمہارا مرض اب بہت بڑھ گیا ہے" کلیان یہ سنکر محض ہنس دیا۔ ڈاکٹر جانتا تھا۔ کہ یہ شخص جاہل ہے۔ چنانچہ اسکے ہنسنے پر حیران نہ ہو کر اُس نے اپنی بات جاری رکھی "تم اب بھی بچ سکتے ہو۔ لیکن اسکے لئے سونے کے انجکشن چاہئیں۔ تمہارے پاس ڈیڑھ دو سو روپے ہیں؟" کلیان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میرے پاس روپے کہاں؟ کوئی رشتہ دار ہے ———؟" کلیان پھر ہنس دیا ———

"دق کے مریض کا رشتہ دار؟ ڈاکٹر صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے پھر پوچھا "گاؤں میں کوئی مکان دکان ہے؟" "جی ہاں۔ ایک ٹوٹا پھوٹا" "تو اسی کو بیچ ڈالو ——"

کلیان اپنے گاؤں گیا۔ اور اپنا جدّی مکان ڈیڑھ سو روپے میں بیچ کر چلا آیا۔

جس روز وہ ہسپتال لوٹا۔ اسی روز اس نے سنا۔ کہ ایک نیا مریض داخل ہوا ہے۔ جسکے ساتھ اسکی بیوی اور ایک پانچسالہ بچہ بھی ہے۔

کلیان اُس نئے مریض کے کمرہ میں گیا۔ اس سے تعارفی باتیں ہی کر رہا تھا کہ ایک خوبصورت سا بچہ کمرہ میں آیا۔ اور ایک اجنبی کو دیکھکر ٹھٹھک گیا۔ کلیان نے بڑھ کر اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اُسے پیار کرتے ہوئے اسکے باپ سے پوچھا۔

"کتنا پیارا بچہ ہے —— کیا نام ہے اس کا ——" اس نے جواب دیا "للت کمار ——" کلیان نے پھر اور کوئی بات نہ پوچھی۔ چپکے چپکے اس بچہ کا منہ دیکھتا رہا۔ اور کچھ دیر کے [illegible] اسکی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے وہ کلیان۔ جسے آجتک ہسپتال میں کبھی مریض نے روتے نہ دیکھا۔ ملول خاطر بھی نہ دیکھا تھا۔ آج ایک اجنبی کے سامنے اسکے بچہ کو پیار کرتا ہوا رو پڑا۔ اُس نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ لئے —— مریض نے پوچھا۔

"تم رو کیوں پڑے —— بھائی ——" کلیان نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "میری بھی بیوی تھی۔ اندرا۔ اور آج پانچسال ہوگئے۔ میرا بھی ایک بچہ

تھا۔۔۔۔۔ للت کمار۔۔۔۔۔" کلیان کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ جن پر اُس نے ہاتھ رکھ لئے ۔۔۔۔۔ مریض سمجھ گیا۔ کہ اُسے اپنے بیوی بچوں کی یاد ستا رہی ہے۔ بھگوان جانے وہ کہاں مصیبت کے دن کاٹ رہے ہونگے ۔۔۔۔۔ اس نے پورا حال جاننے کے لئے پھر پوچھا۔۔۔۔۔ "اب وہ کہاں ہیں۔۔۔۔۔" کلیان نے کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھا "ان بادلوں کے پیچھے کوئی ملک ہے۔۔۔۔۔ وہاں پہلے اندرا گئی۔ اور چھ ماہ بعد وہ للت کو بھی لے گئی۔۔۔۔۔"

اتنے میں بغل کا دروازہ کھلا۔ اور ایک جوان لیکن مرجھائے ہوئے چہرہ والی عورت اندر آئی۔ اور بچے کو بلا کر لے گئی۔ کلیان اور مریض باتیں کرتے رہے۔

کلیان نے پوچھا "ڈاکٹر نے کیا کہا۔۔۔۔۔؟" مریض نے جواب دیا۔ کہ "اگر سونے کے انجکشن کرالو۔ تو بچ سکتے ہو۔۔۔۔۔" "اور پھر۔۔۔۔۔"

"وہ تو صحیح ہے۔ لیکن وہ لاؤنگا کہاں سے۔۔۔۔۔!"

"کیوں۔ محض ڈیڑھ سو روپے میں آجاتے ہیں۔۔۔۔۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی۔ لیکن میں ایک معمولی کلرک ہوں۔۔۔۔۔ کئی سالوں کی جمع پونجی جو پیٹ کاٹ کر جمع کی ہے۔ کل دو سو روپے ہیں۔ وہ بھی خرچ کر ڈالوں۔ اور پھر بھی نہ بچ سکا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔۔ اس عورت اور اس بچے کا کیا۔۔۔۔۔" اس سے آگے مریض کا گلا آنسوؤں سے رونددھ گیا۔

کلیان جیسا سخت دل بھی ان الفاظ کی تاب نہ لا سکا۔ اور چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔

اسکے چلے آنے کے بعد اُس مریض نے اپنی عورت سے کہا "دیکھو تم بھی

عجب ہو۔ ایک بھلا مانس ہمدردی کو آیا۔ اور تم اتنی بے رُخی سے اس سے لڑکا چھین لے گئیں "۔

عورت نے رکھائی سے جواب دیا۔ "واہ۔ آیا تھا کہیں سے۔ کتنا برا اشگن تھا کہ للت کو گود میں بٹھا کر آنسو سے بہانے لگا۔ اس کا لڑکا مر گیا ہو گا۔ تو ہمارے معصوم پر کیوں نظریں گاڑتا ہے "۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بچہ کے سر سے سُرخ مرچیں سات مرتبہ وار کر آگ میں ڈال دیں۔ مریض بیچارا چپ ہو رہا۔

اس شام للت کمار کلیان کے کمرہ کے سامنے سے گذرا۔ تو اس نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ گود میں بٹھایا۔ پیار سے منہ چوما۔ اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا "تمہارا نام للت کمار ہے "۔ بچے نے اسکی قمیص کے بٹن سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "ہوں ——" اس نے پھر پیار سے پوچھا "تم میرے بیٹے ہو"۔ بچے نے کھیل کے انہماک ہی میں جواب دیا "ہوں ——"

اتنے میں باہر سے ایک نسوانی آواز کرختگی کے پہلو میں پکاری "للت"۔ اور للت دوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

کلیان کی آنکھیں نہ جانے کیوں آج بات بات پہ بھر آتی تھیں۔ للت چلا گیا۔ تو اسکے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا —— "دق کا مریض للت سے بھی پیار نہیں کر سکتا ——؟"

کلیان کے ساتھ والے کمرہ میں رہنے والے مریض کا بیان ہے کہ اُس رات

اس نے بار بار کلیان کو یہ فقرہ بڑبڑاتے سنا۔ "للت۔ تم بار بار میرے پاس آتے ہو اور ہر بار اندرا تمہیں مجھ سے چھین لے جاتی ہے۔ لیکن اب کی بار میں تمہیں نہیں چھوڑونگا۔ نہ اندرا کو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلونگا۔"

بہرحال صبح کلیان کے کمرہ میں اسکی لاش پائی گئی۔ اس نے کسی زہریلی شے سے خودکشی کر لی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد خودکشی کی رپورٹ لکھتے ہوئے کہا۔ "چلو۔ اس جاہل سے تو ہسپتال کو چھٹی ملی۔"

لاش کے چہرہ پر تبسم تھا۔ گویا ڈاکٹر کی اس بات پر کلیان مر کر بھی ہنس رہا تھا۔

اُسی صبح اُس نو آمدہ مریض کو اپنے کمرے میں ڈیڑھ سو روپے کی ایک پوٹلی ملی۔ جس کے ساتھ ایک چھٹی تھی۔

"بھگوان کے لئے ان لوگوں کو یہ نہ بتانا۔ ورنہ تم سے یہ روپے چھین لیں گے ——— انکی تہذیب کا قانون یہی ہے۔ کہ وہ دے نہیں سکتا چھین سکتا ہے۔"

ٹنگمرگ۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء

یہ بھی آدمی ہیں

ابھی اس نے کل ہی آنکھیں کھولکر پہلی بار روشنی کی چکا چوند دیکھی تھی۔ اور آج اُس نے دیکھا کہ روشنی کے نمودار ہوتے ہی اُسکی ماں کہیں چلی گئی۔ اسکی ننھی ننھی اور کچی آنکھیں چند ہی قدموں تک ماں کا تعاقب کر سکیں۔ اور تھک کر لوٹ آئیں۔

نجانے اسے کیا سوجھی کہ ننھے ننھے بازوؤں میں طاقت بھر کر اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ اچانک ایک وزنی بازو نے اُسے دبا دیا۔ گردن اُٹھا کر دیکھا۔ تو اُس کا باپ لال لال آنکھیں نکالے اسے اپنے پروں سے دبا رہا تھا بیچارا سہم کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور ایک بار باپ کی خشمگیں صورت دیکھ لینے کے بعد سارا دن اُسے پر تک ہلانے کی ہمت نہ پڑی۔

دوسرے روز ماں گھر پر ہی رہی وہ سارا دن گھونسلے میں پھدکتا پھرا ایک بار گردن لمبی کرکے گھونسلے سے باہر کی دنیا کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اوپر کوئی نیلی نیلی شئے پھیلی ہوئی تھی۔ اسکی نگاہ نیچے کی طرف گئی۔ تو وہ چکرا گیا اور شاید گر ہی پڑتا لیکن اسکی ماں نے جھٹ اسکی ننھی سی دُم چونچ میں تھام لیا۔ وہ سہم گیا۔ لیکن ماں نے شفقت سے پیار کرتے ہوئے دل بڑھایا کہ "میرے لال گھبراتے کیوں ہو۔ بڑے ہوگئے تو اس سے بھی بڑی اونچائیوں سے کود جایا کروگے ——— تب تم بھی ہمارے ساتھ دور اس نیلے آسمان کی پرلی طرف دانہ لانے جایا کروگے۔ وہاں جہاں کھیت ہی کھیت ہیں۔ اس راستہ میں بہت سے اونچے اونچے محل ہیں۔ جہاں سے ہر رات کوئی شرارت کرکے صبحدم ہی سورج شرم سے منہ لال کئے بھاگ نکلتا ہے وہاں ——— اسطرف جہاں سنہرے سنہرے کھیت ہیں ——— تو اپنی بیوی کے بستر بچھانے کے لئے وہاں سے سنہری گھاس کے نرم نرم تنکے لایا کریگا۔"

ماں کی باتیں سنتے سنتے ننھے پنچھی کے دل میں نہ جانے کون کونسی امنگیں سر اُٹھانے لگیں۔ اُس نے ایک بار اپنی دُم کو ابھار کر اور گردن کڑی کرکے آسمان کیطرف نگاہ کی۔ جیسے اُن بلندیوں کو مخاطب کرتا ہوا یہ مصرع گنگنا رہا ہو۔

ع اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

بالآخر وہ دن بھی آیا جب وہ پہلے پہل اپنی ماں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دور تک اڑان کرنے لگا اور آخر کار وہ کھیتوں تک جانے لگا۔

راستے میں وہ شاہی محلوں کے اُوپر سے گزرتے۔ وہاں باغ تھے، ننھے

ننھے خوشنما پھول۔ فوّارے۔ شاندار فلک بوس عمارتیں۔ رنگارنگ پردے قیمتی جھالریں۔ یہ سب چیزیں اُس کے دل کو بہت لبھاتیں۔ ایک روز وہ ماں کو کہہ کر ایک باغ میں اُترا۔ ننھے ننھے بچے خوبصورت ریشمی کپڑوں میں ملبوس اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند عورتیں نفیس جھلمل کرتی ساڑھیاں پہنے خراماں خراماں کیاریوں میں ٹہل رہی تھیں۔ ننھے نے ماں سے پوچھا:۔

"یہ کون ہیں؟"

ماں نے کہا:۔ "یہ آدمی ہیں بیٹا"

اُس نے سوچا "آدمی" یہ آدمی کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ کس قدر عیش مہیّا ہے انہیں"

اچانک اسے ایک خیال آیا اور ماں سے پوچھنے لگا:۔

"لیکن یہ یہاں بیکار کیوں پھرتے ہیں۔ کھیتوں سے دانہ لانے کیوں نہیں جاتے۔؟"

ماں نے جواب دیا:۔

"انہیں یہیں بیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے بیٹا"

اب تو اُسے آدمی کی خوش بختی میں رتی بھر بھی شبہ نہ رہ گیا اور اُس دن کے بعد وہ صبح شام کسی نہ کسی طرح آدمی بننے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ ہر وقت دست بہ دعا رہتا کہ "کاش میں بھی آدمی بن جاؤں"!

اسی طرح چند روز گذر گئے اور آدمی بننے کی خواہش اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔

انہی دنوں ایک دن ماں اُسے کسی اور جانب لے گئی۔ راستے میں چند ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں نظر پڑیں۔ وہاں سے بدبو کا ایک ابر سا اوپر اُٹھ رہا تھا۔ یہاں سے گزرتے گزرتے بیٹا اندھ کے مارے اسکا ناک میں دم آگیا۔ اور اس پر ستم یہ کہ اُن جھونپڑیوں کے کہیں نزدیک ہی اُسکی ماں اُتر پڑی۔

وہاں اُس نے چند چھوٹے چھوٹے بچے بھی جھونپڑیوں سے نکلتے دیکھے۔ پھٹے پُرانے لتے پہنے۔ اُن کے چہرے میلے کچیلے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ بہت سے لڑکے ایک لڑکے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ پہلا لڑکا بیچارا چلاتا جا رہا تھا اور آخر بیچارا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ دوسرے بچوں نے آتے ہی اُسے دبوچ لیا۔ وہ بیچارا روٹی کا ایک ٹکڑا چھپا رہا تھا۔ اور دوسرے اُس سے وہ چھیننے کی کوشش میں تھے۔

اُس نے ماں سے پوچھا:" ماں یہ کون ہیں"!

اُس نے جواب دیا:" یہ بھی آدمی ہیں بیٹا"!

اُس نے پھر پوچھا:" لیکن آدمی تو ایسے نہیں ہوتے اور پھر یہ لڑتے کیوں ہیں؟"

" اس سے یہ روٹی کا ایک ٹکڑا چھین رہے ہیں"!

" تو یہ اور روٹی کیوں نہیں لے لیتے"!

" ان کے گھر شاید اور ہوگی ہی نہیں"!

اتنے میں ننھے پنچھی نے دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے کھیتوں میں سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ اسکی چوٹی سے لیکر ایڑی تک پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ لڑکوں

کے قریب آیا اور انہیں پیٹنے لگا۔ آخر پہلے بچے سے روٹی چھین کر وہ خود کھا گیا بچے اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

ننھے پنچھی نے پھر ماں سے پوچھا:۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ بھی آدمی ہے بیٹا"

تعجب کے مارے اس کے منہ سے نکل گیا، "لیکن اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس نے جھلمل جھلمل کرتی ساڑھی بھی نہیں پہن رکھی، اور یہ چھوٹے آدمی بھی رو رہے ہیں۔ ان کو روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ انکے گھر بھی پختہ اور خوبصورت نہیں۔ بلکہ ہمارے گھونسلوں کی طرح گھاس پھوس کے بنے ہوئے ہیں پھر بھی یہ آدمی ہیں۔ یہ وہاں کیوں نہیں جا بستے جہاں محل ہیں۔ خوبصورت باغ ہیں۔ اور جھلمل کرتے کپڑے ہیں"

ماں نے کہا:۔ "بیٹا یہ آدمی تو ہیں لیکن غریب۔ محلوں والے امیر آدمی تھے یہ غریب لوگ خون اور پسینہ ایک کرکے پیدا کرتے ہیں۔ اور امیر لوگ انکی کمائی چھین کر عیش کرتے ہیں"

ننھا پنچھی اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ اسکے ننھے دل پر ایک چوٹ لگی۔ اُسے جیسے غش آنے لگا۔ ننھے بچے اب تک اس کی جانب متوجہ ہو چکے تھے اُسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کی طرف آتے ہوئے کہہ رہے ہیں "آؤ تم آدمی بنو گے آؤ۔۔۔۔ ہم تمہارا استقبال کرنے آئے ہیں"

وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ بچے اسکو پکڑنے کے لئے دوڑے۔ اسے نجانے کیا ہو گیا تھا کہ اسکے پروں میں پرواز کی طاقت ہی نہ رہ گئی تھی۔ بچوں نے اُسے

آکر دبوچ لیا۔ وہ اب بھی زور زور سے چیخ رہا تھا جیسے بچوں کو کچھ کہہ رہا ہو۔ لیکن اسکی بات کوئی بھی سمجھ نہ سکا ——— آخر وہ آدمی ہی تو تھے ———!
بچے اُسے پکڑ کر پھر ہنسنے لگ گئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی چلا چلا کر انہیں کچھ کہہ رہا تھا ——— وہ اپنی چونچ سے بار بار اُس طرف اشارہ کر رہا تھا۔
جدھر وہ محل تھے اور جھلمل کرتی ساڑھیاں۔

لاہور۔ اپریل ۱۹۳۹ء

گیانو

اتنے دنوں کا میل ملاقات ہوتے بھی میں اُسے اچھی طرح سمجھ نہ سکا تھا۔ اور اگر میں نے اُس کے متعلق کوئی رائے قائم کی بھی تھی۔ تو وہ غلط تھی۔ اُس روز میرے سامنے ہی جب اُس نے سیٹھ کالو رام کو اپنی ڈیڑھ فٹ آگے بڑھی ہوئی توند کو اٹھائے ہوئے اپنی دوکان سے گذرتے دیکھا۔ تو اچانک اسکے لبوں سے یہ فقرہ جیسے پھسل گیا۔

"آخر اس شخص کو اتنی دولت رکھنے کا کیا حق ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ اس شخص میں شعریت اس قدر بھی نہیں۔ کہ اسکی توند کے اندر گھسی ہوئی گہری ناف ہی اس سے لبالب ہو جائے۔ اور دوسری طرف ایسے شخص بھی ہیں۔ جو سر سے لیکر پیر تک اور چمڑے کی بیرونی سطح سے لیکر دل کی گہرائی تک سراسر شعریت ہی

شعریت ہیں۔ لیکن وہ ————— ...."

پھر اچانک اس کی نگاہ میری جانب مڑی۔ اور وہ جیسے چونک کر ٹھٹھک گیا۔ گویا یہ کہتے وقت اُسے اس بات کا احساس نہیں رہا تھا۔ کہ کوئی اور بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس میں پھر وہی سنجیدگی آ گئی۔ جس نے اُسے میرے لئے قابلِ توجہ بنا رکھا تھا۔ کیونکہ ایک دوکاندار کا اسقدر سنجیدہ مزاج ہوتا۔ کہ بعض وقت گاہک سے بھی بات تک نہ کرنا۔ اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ رکھنا کہ میرا گاہک مڑ جائے گا۔ یقیناً قابلِ توجہ ہوتا ہے۔ یہی باعث تھا۔ کہ جب میں نے اس کوچہ میں نقلِ مکانی کی۔ تو گویا نو دوکاندار بھی اُن تین چار ہستیوں میں سے تھا۔ جو اس محلہ کی کلرک آبادی کی عام اور پست سطح سے اُبھری اُبھری معلوم ہوتی تھیں۔

اُن میں سے میرے لئے ہر ایک کی انفرادیت کسی مختلف خصوصیت سے تھی۔ مثلاً لالہ رادھا کشن تھے۔ جنکی ایک مستقل عادت تھی۔ کہ شام کو دفتر سے لوٹے تو گلی ہی میں چارپائی بچھا کر بیٹھ جاتے۔ گلے میں محض ایک بنیان ہوتی اور لمبی نے والا پیچوان تو گویا اُن کا ازلی ساتھی تھا۔ اور اس تصویر کا لازمی جزو کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب بچے ہوتے۔ جنکے بیٹھ جانے کے بعد چارپائی کا کوئی بھی حصّہ نظر نہ آ سکتا تھا۔ یہ بچے خالص انکی اپنی پیداوار تھے۔

اور دوسرا راموچمار تھا۔ جو لالہ جی کے طویلے ہی میں دو روپے مہینہ پر رہتا تھا۔ اُس کی خصوصیت اُسکی حسین بیوی تھی۔ جو غالباً محلہ بھر کی عورتوں سے زیادہ جاذب نظر تھی۔ اُسکے سینہ کی ترچھی سی اٹھان اور اسکے انگوں میں انگڑائیاں

بنتا ہُوا لوچ۔ ایسی خصوصیات تھیں جو کسی بھی راہگیر کے پاؤں باندھ لینے کے لئے کافی تھیں۔ رامو اُسے بہت پیٹا کرتا تھا۔ اور یہ طعنہ تو ہر شام دیا کرتا کہ "وہ دیکھ لالہ رادھا کشن کی عورت۔ تجھ سے دو بالشت چھوٹی ہوگی۔ نین نقش بھی تجھ ایسے نہیں۔ لیکن پھر بھی کتنی زرخیز ہے۔ تجھے تو جیسے کال پڑا ہُوا ہے"۔

اور تیسرا تھا یہی گیانو دوکاندار۔ کوچہ کے سرے والی دوکان میں نمک تیل کی ہاٹ لگائے بیٹھا ہوتا۔ منحنی جسم۔ لمبا قد۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی لیکن آنکھوں میں ایک بانکپن۔ کنگھی کے بغیر بال بکھرے ہوئے جنکی چند لٹیں عموماً پیشانی کو ڈھانپے رہتیں۔ باقی بدن چند بے ترتیب سے کپڑوں میں ڈھنپا رہتا لیکن مجھے پہلی ہی نظر میں اُس بے ترتیبی کے اندر بھی ایک لطیف سی ترتیب کا احساس ہو گیا تھا۔ گویا وہ کوئی شعر تھا۔ جسکے الفاظ کی بے ترتیبی میں بھی ایک وجدانی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔

یہ شخص کچھ عجب طرح کا دوکاندار تھا۔ جسے میں نے گاہکوں سے کبھی دلچسپی سے گفتگو کرتے نہ سنا تھا۔ کسی گاہک کو سودا دیتا۔ تو ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی تلخ فرض انجام دے رہا ہے۔ پہلے پہل تو میں نے یہی سمجھا۔ کہ یہ دوکاندار کا نوکر ہے۔ اور مالک سے اسکی بگڑی ہوئی ہے۔ بلکہ ایکدن تو اسکی حرکت نے مجھے بہت ہی بنا دیا۔ آسمان پر صبح ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور دس بجتے بجتے آسمان پر اُودی اُودی بدلیوں اور کالے اور سفید بادلوں کے جمگھٹ نے کچھ ایسا نظارہ پیش کیا۔ کہ میں اسمیں بالکل کھو گیا۔ اور خدا جانے میں کب تک اسی کیفیت میں رہتا اگر لیلا اچانک میرے کندھے جھٹک کر اونچی آواز میں یہ نہ کہتی "کیا دفتر جانا بھول گئے

——؟ اُس نے خدا جانے ہلکی ہلکی کتنی آوازیں لگانے کے بعد اپنے گلے کا آخری سُر استعمال کیا تھا۔ لیکن اس آسمانی نظارہ کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ مجھے ایسا ہی معلوم ہوا۔ جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ پنجم کے سر میں گا رہی ہو۔ میں نے اسی سرشاری کے عالم میں اسکے گالوں پر ہلکا سا بوسہ دیا اور یہ سوچتا ہوا کپڑے پہننے لگا "آخر چھٹی کا روز کیوں معین ہے۔ کیوں نہ جس روز کسی کا جی چاہے۔ اُسی روز اُسے اتوار منانے کی اجازت ہو"—— بہرحال خواہی نخواہی میں جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ تو لیلا نے اندر سے آواز دی "آنند پوڑے کھانے کو کہتا ہے۔ ذرا گیانو سے سوچ لے کہ تو دیتے جائیے"

میں گیانو کے ہاں پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ جناب کی نظریں زمین پہ پڑتی ہی نہیں آسمان کی جانب ایک ٹک دیکھ رہے ہیں اور خدا جانے منہ میں کیا گنگنا رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار سوجی کی فرمائش کی۔ لیکن مجھے جواب کون دے۔ گیانو تو نہ جانے کس دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ جب پکارنے تک نوبت پہنچی۔ تو اُس نے کسی پہنچے ہوئے صوفی کی طرح شرابی آنکھوں سے میری جانب گھور کر دیکھا مجھے پہچانتے ہی اسکے ماتھے کی تیوری تو دور ہو گئی۔ لیکن اسکے چہرہ پہ کا نشیلا پن جوں کا توں قائم رہا۔ میں نے پھر سوجی مانگی۔ اس نے نہایت بے دلی سے پڑا بند کرتے ہوئے خود ہی اپنی اس حرکت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی——"بابو۔ کیا آج بھی سودا بیچنے کا دن ہے"—— اور میں نے اسکی آنکھوں کے کونوں سے امڈتا ہوا پانی دیکھا۔ مجھے فرصت نہ تھی۔ اسلئے میں کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ لیکن میرے دل میں وہ فقرہ اور اسکی وہ نمناک آنکھیں کچھ اسطرح کھُب گئیں۔ کہ آجتک

اُن کا نقش نہیں مٹ سکا۔ لیکن پھر بھی میں اُسے "گیانو دوکاندار" ہی سمجھتا رہا۔ ایسا دوکاندار جسکے لئے بنئے کا لفظ عام ہے۔ یہ لفظ خود اس قدر تصوّر زا ہے۔ کہ اسکی تشریح فضول ہے۔ لیکن آج جو فقرہ سیٹھ کا لورام کو جانتے دیکھکر اسکی زبان سے از خود پھسل گیا۔ اُس نے مجھے یقین دلا دیا۔ کہ میں نے اُسے آج تک غلط سمجھا تھا۔

میرے مجبور کرنے پر اُس نے اپنی جو داستان سنائی۔ اس سے میرے جذبۂ تجسس کو تو سکون حاصل ہو گیا۔ لیکن میرے دل کا سکون چھن گیا۔ آجتک جب بھی مجھے اُس دوکان کے سامنے سے گذرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو گیانو دوکاندار کو ایک کاغذ پر کچھ لکھتے دیکھ میری آنکھیں ڈبڈیا آتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ آنسو گیانو کے انجام پر بہتے ہیں۔ یا اُس کاغذی پُرزے کے ہونے والے انجام پر۔ اور ہر بار میرا دماغ اس کہانی کو دہرا جاتا ہے —— کہ کسطرح اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث وہ اُن کی آشاؤں کا مرکز تھا۔ جو بڑھاپے کی اوبڑ کھابڑ زمین میں ڈگمگاتے بوڑھوں کا سہارا ہوگا۔ اُن کا گھرانا مالی لحاظ سے اُس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو وسطی طبقہ سے کچھ نیچے لیکن بھیک منگوں اور مزدوروں کے طبقہ سے کچھ اونچا ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ اکلوتا بیٹا نہ ہوتا۔ تو شاید اس کی تعلیم ابتدائی حدود بھی پار نہ کر سکتی۔ بہر حال اسی خصوصیت کے سبب وہ میٹرک تک تعلیم پا چکا تھا۔ اور اس سے زیادہ انکی ہمت سے باہر تھا۔

بدقسمتی سے اس تشنۂ تکمیل ذہنی ارتقاء نے اس کے ایک فطری جوہر کو بے نقاب کر دیا ہے جسے اس کے ذوق و شوق نے بعد ازاں خوب جلا دی۔ یہ جوہر تھا ——— شاعری۔

چونکہ قدرت ہی کی جانب سے اُسے شاعری ودیعت کی گئی تھی۔ اسلئے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ جوہر کچھ اسطرح چمکا۔ کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن ادھر وہ اس پریم رس میں ڈوبتا چلا گیا۔ اُدھر اسکے ماں باپ کو ایسا محسوس ہونے لگا۔ کہ لڑکا ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ اُنکی آشاؤں پہ پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے ہر طرح اُسے اس راہ پر جانے سے روکنے کی سعی کی۔ لیکن یہ اُسکے بس کی بات تھوڑا ہی تھی۔ وہ تو جیسے کسی غیر مرئی کشش کے باعث اس ندی کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں پانی اسکے مختلف اعضاء کو ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی۔ کہ وہ از خود رفتہ سا ہو کر اسکی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

یہ عالم دیکھ کر اسکے ماں باپ اور زیادہ جھنجھلاتے۔ وہ اسکی بے بسی کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے بھی کیوں کر۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک شاعر شاعری کرنے پر مجبور کیوں ہوتا ہے۔ اس بات کو تو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو یہ جانتے ہیں۔ کہ ایک شرابی شراب کیوں پیتا ہے۔ ایک عاشق عشق سے کیوں منہ نہیں موڑ سکتا۔ اور ایک مور ساون کے بادلوں کو دیکھ کر کیوں دیوانہ وار ناچ اٹھتا ہے۔

اسی رستہ کشی کے ساتھ ہی ساتھ اسکی شہرت پرواز کرنے لگی۔ مشاعروں

ہیں اچھے اچھے لوگ اُسے داد دینے لگے۔ جن میں کئی ایک شعر نواز امیر شخص بھی تھے۔ سٹیج پر وہ لوگ اسکے متعلق جن جذباتی الفاظ کو استعمال میں لاتے۔ اُن سے اسکے کشمکش میں پھنسے ہوئے دل کو بہت تسکین ہوتی۔ حتیٰ کہ اُسے یقین ہو چلا کہ یہ لوگ سچ مچ مجھ پر بہت کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ اخبارات و رسائل میں اسکا کلام تعریفی حواشی کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ ان سب باتوں سے اُسے یقین ہوتا چلا گیا۔ کہ اسکی اقتصادی مشکلات بھی شاعری کی بدولت آسان ہو جائینگی۔ وہ اس انتظار میں رہتا۔ کہ جو رسائل اسکے کلام کے متعلق یہانتک لکھ جاتے ہیں۔ کہ "حضرت ——— کا کلام سونے کے تول تلنے کے قابل ہے"! ضرور اگر سونا نہیں۔ تو اسکے مقابلہ پر کوئی حقیر سی رقم اسکی نذر کرینگے۔ لیکن یہ خواب خواب ہی رہا۔ یہانتک کہ ایک بار جب خود ہی اس نے اس بارے میں ایک مدیر کو کہلوایا۔ تو اس نے نہایت "خلوص" کے ساتھ جواب بھیجا۔ کہ رسالہ تو پہلے ہی گھاٹے میں چل رہا ہے۔ یہ تو "خدمتِ ادب" کا جذبہ ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہیر دھندا کئے جا رہے ہیں۔ اور کوئی ہوتا۔ تو کب کا کپڑے پھاڑ کر بھاگ گیا ہوتا"۔

بھولے شاعر کو انکے خلوص پر کوئی شک نہ ہوا۔ اور نہ اُسے اُن اشخاص کے خلوص پر شک گذرتا۔ جو مشاعروں میں سٹیج پر آکر اُس سے نہایت پریم بھری باتیں کرتے۔ اور کہتے ——— "آنکھیں ترس جاتی ہیں لیکن مشاعروں کے سوا آپ کی صورت دیکھنے ہی میں نہیں آتی"۔ وہ نہیں

جاتا تھا۔ کہ ایسے ایسے فقرے محض رسمی طور پر کہہ دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ کہنے والے کی مراد بر نہیں ہوتی۔ وہ اسیطرح کے رسمی تکلّفات کے فریب میں مبتلا رہا۔ اسکے ان رسمی مداحوں میں چند ایک امیر شخص بھی تھے۔ جن سے اس نے اپنی بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھی۔ لیکن اس دل خوش کن سراب کا فریب بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ امیر لوگ شاعروں کو محض اپنا دل بہلاوا سمجھتے ہیں۔ اور اگر سٹیج پر انکی تعریف کرتے ہیں تو اسلئے نہیں۔ کہ وہ درحقیقت انہیں کوئی ممتاز ہستی سمجھتے ہیں۔ بلکہ محض اسلئے تاکہ وہ لوگ انکے تفریح بخش کھیل کو جاری رکھیں۔ وہ چند ایک اشخاص کے ہاں (اپنی دانست میں) انہی کی دعوت پر گیا۔ لیکن وہاں اُسے گھنٹوں ڈیوڑھیوں میں انتظار کرنا پڑا۔ اور جب ملاقات بھی ہوئی۔ تو اُسے اپنے میزبانوں کا روّیہ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کسی بھک منگے سے باتیں کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر اسکے ولولوں پر اوس پڑ جانا لازمی تھا۔ لیکن وہ شاعر تھا۔ ایک حقیقی شاعر ——— جو کسی صلہ کی پروا یا ستائش کی تمنا میں شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اسلئے کہتا ہے۔ کیونکہ وہ شعر کہے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کوئی سننے والا ہو یا نہ ہو۔ لیکن وہ اپنا پیغام سناتا جائیگا۔ اور جب کبھی کسی ایک ہستی کا دل تڑپ اٹھا۔ کسی اہلِ دل کی آنکھ سے آنسو کا ایک ہی قطرہ ٹپک پڑا۔ یا اُسکے پیغام کو سُنکر کسی ایک روح نے اپنے بازوے پرواز کھول دیئے۔ یا کسی نے اُسکے پیغام سے متاثر ہوکر کبھی کسی یتیم بچے کو پیار سے اپنی گود میں لے لیا۔ یا کسی افسر نے اپنے کسی ہر وقت جھڑکے جانے والے غریب و مفلس چپڑاسی سے ہنسکر ہی بات کر لی۔

تو اُس کا مقصد ——— اُسکی شاعری کا مقصد اُسی دم پورا ہو جائیگا۔ خواہ ان میں سے ایک بھی واقعہ اسکی حیات میں ظہور پذیر ہو یا بعد الموت۔ غرضیکہ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز بحرِ شاعری کی گہرائیوں سے موتی رولتا رہا۔

اس کے ماں باپ بھی (اپنی دانست میں) بگڑے ہوئے لڑکے کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ لیکن اس نے سدھرنا تھا نہ سدھرا۔ آخر کار انھوں نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالنے کی ٹھانی۔ اور یہ ہتھیار تھا ——— شادی۔ ان جہاندیدہ بزرگوں کو یقین تھا۔ کہ جب بیوی پہننے کھانے کو مانگے گی۔ تو اسکی تمام شاعری نکل جائے گی۔

ایک روز ماں نے بیٹے سے نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہا "تمہارا باپ فلاں جگہ نسبت کرنے کو کہتا ہے۔ میں لڑکی دیکھ آئی ہوں۔ نین نقش ایسے سندر ہیں گویا آسمان سے کوئی اپسرا اُتر آئی ہے۔ ہماری ذات برادری میں تو ایسی لڑکی ملنی کیا دیکھنی تک مشکل ہے"!

شاعر۔ اور پھر حُسن کی تعریف سنکر مچل نہ جائے۔ پھر وہ شاعر ہی کیا۔ نادان اس تجویز سے بلکہ خوش ہو گیا۔ اُس نے سوچا۔ کہ "پہلو میں کسی حسین کی موجودگی میرے تخیل کو پر لگا دے گی۔ کسی کی مدماتی آنکھوں کی شراب میں تمام دنیاوی تفکرات ڈوب جائیں گے" ——— لیکن اس نے یہ نہ سوچا۔ کہ اس شراب کی قیمت اُسے کیا ادا کرنی پڑے گی۔

شادی کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُسی کی زبان سے سنیئے۔

"بابو۔ آپ نے کبھی اُس شخص کو دیکھا ہے۔ جس نے راہ پر خود منزل کو قربان کر دیا۔ یا وہ شخص جس نے اپنی کشتی کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے اسکی مرمت کرائی ہو۔ اور اس مرمت کے عوض میں اپنی وہی تاؤ دے ڈالی ہو۔ اور خود پرے کنارے پر ہی رہ گیا ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو مجھے دیکھو۔ جس نے اپنی شاعری کو جلا دینے کے لئے ایک حسین سے عقد کیا۔ اور اسکے عوض اسی شاعری کو نذر کر دیا۔

اگر ہمارے گھر میں کچھ باقی تھا۔ تو وہ میری شادی کی بھینٹ ہو گیا۔ چند ہی روز بعد افلاس اپنی ننگی صورت میں تانڈو ناچ ناچنے لگا۔ بھوک کے بھوت ہمارے گھر کی بنیاد میں تک ہلاتے نظر آنے لگے۔ مجھے مجبور ہو کر کوئی کام ڈھونڈنا پڑا۔ پہلے پہل میں نے کوشش کی۔ کہ کوئی ایسا کام ملے۔ جو میری شاعری میں دخل انداز نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ کہ کہیں کلرکی مل جانے پر مجھے شاعری کے لئے بھی وقت ملتا رہیگا۔ بھولا شاعر۔ اُسے کیا معلوم تھا کلرکی کس مصیبت کا نام ہے! میری امید کی آنکھیں ایک بار پھر اپنے امیر مداحوں پر اٹک گئیں۔ میں نے ان سے سفارشیں کروانا چاہیں۔ لیکن اب کی بار وہ ہوا۔ جو پہلی مرتبہ کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے دھتکار دیا گیا بعد ازاں مجھے انکے منشی متصدیوں سے پتہ چلا۔ کہ میرے دھتکارے جانے کی بڑی وجہ میری شاعری تھی۔ میرے ان مداحوں کا خیال تھا۔ کہ "شاعری کی لت پڑ جانے پر انسان کسی بھی کام کا نہیں رہتا۔ پھر دفتر کی ذمہ داریاں اٹھانے جوگ کہاں ——" گویا وہ آجتک میری مدح اسلئے کرتے رہے۔ کہ میں نکمے سے نکما تر" بنتا چلا جاؤں۔ لیکن اُسوقت میرے پاس یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت ہی کہاں

تھی - بلکہ یوں کہو - کہ دل گرفتگی تک کی فرصت نہ تھی - مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا کیونکہ چار مدھم اور بوڑھی آنکھوں کے آنسوؤں اور دو شوخ و حسین آنکھوں کے موتیوں کو اس فراوانی سے ضائع ہوتے دیکھنے کا مجھ میں یارا نہ تھا - اور اس کے بعد ——— یہ نمک تیل کی دوکان" وہ ایک پل کے لئے رک گیا - ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے اس نے پھر کہا "اب میں سمجھ چکا ہوں - کہ جذبات کی رو حقیقت کی ندی میں نہیں بہتی - یہ ہے ایک شاعر کی ٹریجڈی"

"اب مجھے گیا تو دوکاندار کہہ کر پکارتے ہیں - کس قدر غیر شاعرانہ نام ہے ——— میرا نام گیا تیشو رتھا - لیکن ایک تیل نمک بیچنے والے کو کسی خوبصورت نام سے پکارنا گویا گناہ ہے - اور یہ بذات خود ایک ٹریجڈی ہے" ——— وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا - اسکی کہانی ختم ہو چکی تھی - مجھ میں اٹھ آنے تک کی ہمت نہ رہی تھی - میں اپنی قوت کے لوٹنے کا منتظر تھا - کہ اچانک وہ پھر بول اٹھا -

"میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے - کہ شاعری بھی ایک طرح کی قومی لیڈری ہے جس میں کامیابی و ناموری حاصل کرنے کے لئے اپنی جیب میں خوب دولت چاہیئے - مفلس لیڈر ایک گمنام رضا کار ہی رہ جاتا ہے - اور مفلس شاعر نمک تیل کا دوکاندار "

"گیا تو - یہ لالٹین تیل سے بھر دینا" ایک ننھی سی لڑکی نے دوکان کے تختے پر پیسہ پھینکتے ہوئے کہا -

گیا تیشو رنے نہایت حقارت سے پیسہ واپس بازار میں پھینک دیا - "جا بھاگ جا" لڑکی اس عجیب و غریب دوکاندار کا منہ دیکھتی ہوئی پیسہ اٹھا کر چلی گئی -

تھوڑی دیر تک گیا تو اسی کیفیت میں رہا۔ گویا کسی کو گالیاں دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ عالم بدل گیا۔ گویا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اس نے دوکان کے باہر سر نکالکر بازار کے اندھیرے میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اسکے لبوں سے ایک مایوسانہ آواز نکلی "چلی گئی ——" پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُن سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے بابو۔ کہ میں دوکانداری میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ گویا میرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔ میں نے ابھی ایک پیسے کا گاہک گنوا دیا۔ اور کیا جانے کہ یہ گاہک پھر کبھی میری دوکان پر آئے بھی یا نہیں آج صرف دو آنے پیسے دیکر دو حسین سی آنکھوں کی چمک جب ٹیالی پڑجائیگی تو کیا میری زندگی اندھیری نہ ہو جائیگی۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ الم پر الم اٹھانے سے شاید دل بجھ جائے۔ اسکی امنگیں مرجائیں۔ تو میں دوکانداری میں کامیاب ہو جاؤنگا۔ لیکن یہ خیال اُسی وقت تک رہتا ہے۔ جب تک ایک حسین اور نازک بدن ملگجے چیتھڑوں میں میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے جب صبح دوکان پر آتے ہی وہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ تو شاعری دیوی آن موجود ہوتی ہے پھر جب شام آتی ہے۔ اور گھر جانے کو تیار ہوتا ہوں۔ تو اپنی سارے دن کی کمائی دیکھتے ہی اپنی ناکامی کا احساس ہو آتا ہے۔ دن بھر میں بیخودی کے عالم میں جو جو تنابہ حکائی کی ہوتی ہے۔ اُن تمام اشعار کو آگ کی نذر کر دیتا ہوں تاکہ ان جگر کے ٹکڑوں سے زیادہ پیار نہ بڑھ جائے"۔

یہ کہتے کہتے گیا نیشور نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالکر دیئے کی لَو پر رکھ دیا۔ شاید یہ اسدن کی "شاعرانہ" کارروائی تھی۔ مجھ میں اسکے ہاتھ سے یہ کاغذ

چھین لینے کی سکت بھی نہ رہ گئی تھی۔ البتہ جلتے ہوئے کاغذ کے ایک کونہ پر میں نے یہ مصرعہ دیکھا۔ ع

پھر وہی میں ہوں وہی صحرا وہی بربادیاں

اب بھی جب کبھی میں وہاں سے گذرتا ہوں۔ تو "گیانو دو کا مزار" کو ایک کاغذ پہ کچھ لکھتے دیکھ میری آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ آنسو گیانو کے انجام پہ بہتے ہیں۔ یا اس کاغذی پرزے کے ہونے والے انجام پہ۔

ٹنگمرگ ۔ ستمبر ۱۹۴۱ء

مذہب

کوئی لالچ کسی قسم کا ڈر اور کوئی چھوٹی بڑی مصلحت بھی سُرجو کو جھوٹی گواہی دینے پر مجبور نہ کر سکی۔ زمیندار صاحب نے فوراً باقی وصول کر لینے کی دھمکی بھی دی۔ لالہ کے کارندوں نے اُسے طرح طرح کے لالچ دیئے۔ لیکن سُرجو کو اسوقت گیتا کی نصیحت یاد آ رہی تھی۔ کہ جھوٹ بولنا مہا پاپ ہے۔ اور آخر کارندوں نے لالہ کو یہی صلاح دی۔ کہ ایسے ایسے احسان فراموش بھی باتوں سے تھوڑا ہی مانتے ہیں۔ پولیس کے ڈنڈے سے خود ہی مانے گا۔ سُرجو نے اس بات کو اپنی خوش قسمتی تو تسلیم کر لیا۔ کہ زمیندار صاحب اسکے گھر آئے تھے۔ لیکن جھوٹ بولنے کی اسکا مذہب اجازت نہیں دیتا تھا۔

دوسرے ہی دن اُسے گواہی دینے کے لئے جانا تھا۔ خلاف معمول وہ منہ اندھیرے

ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی کے پوچھنے پر اُس نے بتایا۔ کہ آج مجھے گواہی دینے جانا ہے اسلئے میں آج اپنی مذہبی کتب کے اس حصے کو اچھی طرح یاد کر لینا چاہتا ہوں جہاں لکھ رہا ہے۔ کہ ہزار دشواریاں تو کیا۔ اگر موت بھی سامنے آجائے تو بھی انسان اپنے دھرم اور سچائی کا دامن نہ چھوڑے۔

اسکی بیوی جھلائی۔ وہ جو کچھ خاوند کو سکھانا چاہتی تھی۔ وہ کسی طور سمجھتا نہ تھا۔ بیوی کو یہ دکھ کھائے جارہا تھا۔ کہ اُسکی ہمسائیوں نے چاندی کے کڑے بنوالئے تھے۔ کسی کسی نے نو لکھے کی ہنسلی بھی بنوالی تھی۔ کسی نے نئے کپڑے سلوالئے تھے۔ لیکن اُسکی خواہشات میں ہر بار اسکے خاوند کی راست پسندی سدِ راہ ہو جاتی ہے۔ وہ یہ دیکھکر جھنجھلائی۔ کہ خوشامد کرنے والے اور ایک ایک سانس میں سو سو جھوٹ بولنے والے تو مزے سے زندگی کے دن گذار رہے ہیں لیکن اسے رات کو کھانا پکانے کے لئے روز ہی کسی کا کام کر کے آٹا لانا پڑتا ہے چنانچہ آج اس کے دل کے بند کھل گئے۔ وہ رو پڑی۔ لیکن اس کا دکھ بھی سُرجو کو متزلزل نہ کر سکا۔

شام کو جب سُرجو کی بیوی اپنے چھوٹے سے بیٹے کو بھوک سے چُپ کرانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ ”تمہارے بابو شہر سے مٹھائی لائیں گے۔ کھلونے لائیں گے۔“ اور بیٹا عالم تصور میں ان کھلونوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جیسی چڑیا زمیندار کے لڑکے کے پاس ہے۔ اسکا باپ اسکے لئے اس سے بڑی چڑیا لائیگا۔ اور تب زمیندار کے لڑکے کو وہ کھجائیگا۔ بیچارہ نہیں جانتا تھا کہ اسکا باپ اُسی زمیندار کا دستِ نگر تھا۔ نادان بچہ اپنے باپ کو شاید زمیندار کا سیٹھ سمجھتا تھا۔

اور اس کا باپ باہر کھڑا بچے کی یہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ بیچ بیچ میں بھوک کے شدید زلزلے اس بچے کے خیالی محلات کو ایک سیکنڈ میں گرا دیتے۔ لیکن ماں کی میٹھی میٹھی باتیں پھر وہ جادو کا محل کھڑا کر دیتیں۔ اسے ہمت نہ پڑی کہ وہ خالی ہاتھ اندر جا کر بچے کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دے۔

وہ واپس چلا گیا۔ اور اس نے زمیندار سے کٹائی کی باقی مزدوری طلب کی۔ لیکن زمیندار تو آج اس پر جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس نے گواہی جو زمیندار کے حق میں نہیں دی تھی۔ پولیس افسر کے سامنے تو وہ اُسے کچھ کہہ نہ سکا۔ اسی لئے دوسرے دن کی تاریخ لے لی۔ اور اب سوچ رہا تھا۔ کہ اسکی گواہی کیسے کلوائے اسے دیکھ کر اور پھر اس کے مزدوری مانگنے پر تو اسے آگ سی لگ گئی۔ اس نے جوتے لگوا کر باہر نکال دیا۔ وہ پھر واپس آیا۔ اور اب کی بار اسکے گھر میں بھوک کی ایک ایسی آندھی چل رہی تھی۔ جس کے سامنے تصوّر کا کوئی بھی محل کھڑا نہ رہ سکا۔ کھلونے سے کھیلنے کے خیال بھی تیز ہوا میں اڑ گئے۔ لڑکا بھوک سے بے چین ہو کر تڑپ رہا تھا۔ اور اب تو باپ کو کوس رہا تھا۔ کہ وہ جلدی کیوں نہیں آتا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اور ان دونوں کے آنسوؤں نے سُرجُو کے دل میں ایک ندی بہا دی، دُکھ کی۔ اور دھیرے دھیرے اس ندی میں باڑھ آ گئی۔ اور اتنے زور کا طوفان آیا۔ کہ وہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ سُرجُو کا عزم عصیم بھی بہہ گیا۔ وہ بے تحاشا زمیندار کے گھر کی طرف بھاگا۔ اور گواہی کا وعدہ کر کے اس سے چند روپے بھی لے آیا۔

دوسرے دن وہ پہر دن چڑھے تک بھی چارپائی سے نہیں اٹھا۔ آج

پہلا دن تھا۔ کہ اس نے مندر جانے سے ناغہ کیا۔ اس کی بیوی نے اسے بار بار جگایا۔ وہ یہ کہہ کر پھر لیٹ جاتا "صرف کچہری ہی تو جانا ہے۔ دس بجے اٹھ کر چلا جاؤنگا"۔ اسکی بیوی نے ایک بار پوچھا "آج آپ مندر بھی نہیں گئے۔ گیتا کا پاٹھ بھی نہیں کیا"۔

وہ مندر کا نام سُنکر اٹھ بیٹھا۔ اور ہنسنے لگا ——— ایک بے معنی سی ہنسی ——— اور پوچھنے لگا "آخر مندر اور گیتا کی کیا ضرورت ہے"۔ بیوی بولی "کچھ مذہب کا بھی خیال ہے یا نہیں"۔ وہ ہنسا۔ اسکے منہ سے نکلا۔ "مذہب"۔ اور اپنی جیب کے چند روپے اس نے زور سے چھنچھنا دیئے۔

لاہور۔ مئی ۱۹۳۹ء

دُکھیا کا ھمدرد

پائین باغ کی چار دیواری کے باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رئیس اعظم چہل قدمی کرتے کرتے رُک گئے۔

"چوبدار۔ دیکھو باہر یہ کون منحوس ہے ــــــــ سویرے سویرے ــــــــ سیر کا مزہ کِرکِرا کر دیا!"

اور باہر وہ گداگر جانے کب سے اُس چھ فٹ اونچی دیوار کے سائے میں پڑا کراہ رہا تھا۔ رات بھر کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ سنتا بھی کون۔ وہ باغ کی دیوار کے سائے میں تھا نہ۔ جو اُس باغ میں ٹہلتے ہیں۔ وہ رات کو جاگتے نہیں۔ اور جو رات کو جاگتے ہیں۔ انہیں باغوں میں ٹہلنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اسکی آواز سنتا کون۔ رات بھر کھلے میں پڑا رہنے کے

باعث اس کا جسم سردی کے مارے اکڑ گیا تھا۔ بلکہ بدن کا بند بند درد کر رہا تھا۔ اس پر دس روز کا فاقہ۔ درد کہتا تھا۔ کہ زبان کھول لیکن بھوک کے سبب رگوں میں کچھ ایسا تشنج پیدا ہو گیا تھا۔ کہ منہ کھل کر رہ جاتا۔ زبان نہ کھلتی۔ حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل جاتی۔ جو اس چھ فٹ اونچی چار دیواری سے ٹکرا کر اسی کے کانوں کی راہ پھر اسی دل میں سما جاتی۔ جو پہلے ہی درد و الم سے بھرا ہوا تھا۔

چوبدار آیا۔ اور چلا گیا۔ آخر اس کی آواز کسی نے سن تو لی۔ کوئی پوچھنے تو آیا۔ خواہ وہاں سے فوراً اٹھ جانے کا حکم لے کر آیا۔ دل نے کہا شکر ہے کسی نے پوچھا تو۔ اب دل میں یہ حسرت تو نہ رہے گی۔ کہ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اب یہ اطمینان تو ہے۔ کہ اس کا کراہنا کوئی سنتا ہے اسی کامیابی کی خوشی میں اس نے زور سے کراہنے کی کوشش کی۔ لیکن بھوک سے نڈھال ہو کر اس کی آواز گلے ہی میں بیٹھ گئی۔ فاقہ کشی کی شدت نے اسے بیہوش کر دیا۔

"چوبدار۔ وہ کون تھا ——"

"حضور ایک گداگر۔ کہتا تھا۔ دس دن سے بھوکا ہوں۔ سردی کے مارے اکڑ گیا ہوں ——"

رئیس اعظم کے چہرہ کے خطوط کچھ اسطرح آڑے ترچھے ہو گئے۔ گویا کسی نے حقارت و نفرین کے الفاظ تراش دیئے ہوں "ان لوگوں کا تو کسب ہی یہی ہے۔ تمہیں نقلی اور اصلی کراہنے کی پہچان بھی نہیں۔ دیکھا جب اسے بند

چلا۔ کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ تو کس طرح چپکا ہو گیا ——— سویرے سویرے۔ کوئی رام کا نام جپتا ہے۔ کوئی کچھ ——— اور یہ آیا ہے دکھڑا سنانے۔ جانے آج دوکانداری کیسی رہے گی "

رئیس اعظم صبح چار بجے کے قریب پیشاب کی غرض سے اٹھے باہر کہیں سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ آواز انکی پہچانی ہوئی تھی۔ انہیں سب کام بھول گئے۔ آنکھوں سے نیند ہوا ہو گئی۔ اپنا سمور کا کمبل لینا بھی یاد نہ رہا۔ دروازہ کھولا۔ اور ننگے پنڈے ہی باہر کی جانب لپکے۔ کوٹھی بھر میں کہرام مچ گیا نوکر چاکر گھبرائے ہوئے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ کہیں برانڈی لائی جا رہی تھی۔ اور کہیں روئی۔

سیٹھ صاحب خود انگیٹھی میں کوئلے پھونک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہی بستر میں اُسے لٹا دیا تھا۔ دوکان جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ لیکن جب تک ڈاکٹر نہ دیکھ جائے۔ انہیں چین کہاں۔ بار بار اسکے منہ کی طرف دیکھتے تھے۔ وہ رات بھر سردی میں باہر ٹھٹھرتا رہا۔

نوکر چاکر ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے " اتنے دیالو ان سیٹھ میں کہ کسی کا دُکھ تو اُن سے دیکھا ہی نہیں جاتا ——— "

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا۔ سیٹھ صاحب کی آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں۔ " ڈاکٹر صاحب۔ ذرا اچھی طرح دیکھئے گا۔ یہ بڑا برکت والا جیو ہے۔ میرے تو گھر کی رونق ہی اسی سے ہے ——— "

ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیٹھ صاحب۔ اسے ذرا سردی لگ گئی ہے۔ شام تک ٹھیک ہو جائیگا"

جیب میں فیس ڈالتے وقت اس نے پھر تسلّی دینے کی غرض سے کہا۔ یقین رکھئے۔ آپ کا ایسا قیمتی کُتّا میں اس معمولی سی تکلیف سے ضائع نہیں ہونے دونگا۔ آپ کی آنکھیں کیوں ڈبڈبا رہی ہیں!"

"کیا کروں۔ ڈاکٹر صاحب۔ کوئی دکھیا تو مجھ سے دیکھا بھی نہیں جاتا!"

لاہور۔ مئی ۱۹۳۹ء

جنگ کا نام سنتے ہی ہر ایک کے دل میں ایک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ راجپوتی خون رگ رگ میں کھول رہا تھا۔ گنیش گڑھ کے نوجوان مہاراج کی سالگرہ کے جشن میں شرکت کے لئے ریاست بھر سے بانکے راجپوت راجدھانی میں آئے ہوئے تھے۔

راجدھانی کا کونا کونا جگمگا رہا تھا۔ اسکے ہر بُن مو سے مستی پھوٹی پڑتی تھی۔ اسکی سج دھج ایسی تھی۔ جیسے کسی نئی نویلی دلہن کی۔ لیکن بہادر راجپوت ہمیشہ سے جنگ کی خاطر اپنی نویلی دلہنوں کو انکے گھونگھٹ تک اٹھائے بغیر چھوڑتے آئے ہیں۔

جنگ ــــ جنگ انکے لئے شیر مادر سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ انکی زندگی کا ایک ایسا جزو۔ جسکے بغیر انکی مردانگی۔ انکی دلاوری بلکہ خود ان کی زندگی بھی اکارت تھی۔ انہیں جنگ کی وجہ پوچھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ــــ بات بات پر میان سے تلواریں کھینچ لینا انکے لئے روزمرہ کا معمول تھا۔

وزیر اعظم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کہ "چینت پور ایک بڑی ریاست ہے لیکن راجپوت اپنی آن سے بڑا اور کسی شئے کو نہیں جانتے۔ اور اسی آن کے لئے ہمیں چینت پور تو کیا۔ اس سے بھی بڑی طاقت سے بھڑ جانے میں جھجک نہیں ــــ"

اور مجمع میں ایک بھی آدمی ایسا نہ تھا۔ جو یہ پوچھتا۔ کہ "آخر کیوں ہمیں جنگ کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے۔ دونوں ریاستوں میں کون سی ایسی الجھن ہے جو سلجھائی نہیں جا سکتی"؟

وہاں اتنا پوچھنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ جوش کی ایک ہی لہر تھی جو مجمع کے اس چھوٹے سے بڑے چھوٹے تک بڑھتی چلی گئی تھی۔

گویا مجمع کے مختلف افراد ایک ہی دل کے ٹکڑے تھے۔ جن میں جنگ کا لفظ سنکر ایک ہی ساتھ جوش ابل پڑتا تھا۔ وہ راجپوت تھے جنہیں جنگ شیر مادر سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

وزیر اعظم اپنے محل کو لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا

آنے والے خطرہ سے عوام کو آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس ٹیلے کو آگ لگادی تھی۔ جس کا دوسرا سرا بارود کی کوٹھڑی میں کھلتا ہوگا۔ چند منٹ ——— اور اسکے بعد جنگ۔ ایک خونریز جنگ۔ جسمیں خون کی ندیاں بہ نکلیں گی ندیاں .... جن کا پاٹ اس ریاست سے اُس ریاست تک پھیلا ہوا ہوگا جن کی بھیانک لہروں میں بہت سی نویلی دلہنوں کے سہاگ ڈوب جایئں گے۔ دلہنیں ——— جنہیں یہ حسرت رہ جائیگی۔ کہ کوئی ایک بار ان کا گھونگھٹ اٹھا کر کہے۔

" یہ نظریں زمین میں کیوں گڑی ہوئی ہیں۔ انہیں تیر دل کیلئے تو ہم نے سینہ سپر کر رکھا ہے" اور پھر ٹھوڑی پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بھیگے ہوئے لبوں پر دو انگارے سے رکھ دے ———

اکثر دلہنوں کے دل میں یہ حسرت رہ جاتی رہی ہے۔ بہادر راجپوت ہمیشہ سے جنگ کی خاطر نویلی دلہنوں کو انکے گھونگھٹ تک اٹھائے بغیر چھوڑتے آئے ہیں۔

" گنیش گڑھ کے باسنکے لڑائی کی وجہ پوچھنا نہیں جانتے۔ جینت پور والوں نے جانے کیا سمجھ رکھا تھا۔ انکی راجکماری کا رشتہ قبول نہ کرنے سے اگر ان کی ہتک ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے بے عزتی کا بدلہ جنگ میں لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ تو ہم نے کون سی چوڑیاں پہن رکھی ہیں ——— راجکماری کا رشتہ ...... وہ نہیں جانتے۔ کہ گنیش گڑھ کی رانی وزیر اعظم کی اکلوتی لڑکی اناکشی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ نوجوان مہاراج کے دل میں بس چکی

ہے۔ اگر جینت پور والے اسکے لئے جنگ لڑینگے۔ تو آئیں ——— ہمارا بچہ بچہ اپنی آن پر کٹ مریگا۔ راجپوت اپنی آن سے بڑھی اور کسی شئے کو نہیں مانتے"!

وزیر اعظم کے خیالات ایک ساعت کے لئے منتشر ہو گئے۔ سامنے پنگھٹ پر جوان لڑکیاں جھرمٹ بنائے بیٹھی تھیں۔ وہ پانی لینے آئی ہوئی تھیں۔ چند ایک کی بلوّرین کلائیوں میں سرخ رنگ کی چوڑیاں بتا رہی تھیں۔ کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہاں ایسی کنواریاں بھی تھیں۔ جو شادی کی باٹ دیکھ رہی تھیں۔ شادی شدہ لڑکیاں جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں تو انکی نگاہوں میں ایک عمیق راز ہوتا۔ جسے دیکھ کر کنواریاں ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں۔ انکی چولیوں پر سلوٹیں پڑی دیکھ کنواریوں کے سینوں میں دل مچل مچل جاتے۔ انکی چوڑیوں کی چھنک سنکر وہ اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے پانی میں ڈبو کر زور زور سے ملنے لگ جاتیں۔

یہ سُرخ چوڑیوں کی چھنک ہی تھی۔ جس نے وزیر اعظم کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ لڑکیاں اپنی سُرخ چوڑیوں کو دھو رہی تھیں۔ کیا جانے کہ چند ہی ہفتوں بعد ان میں سے کئی ایک کی چوڑیوں کی سرخی کسی کا خون بن کر بہ جائے پھر وہ بھی کسی کی سُرخ چوڑیوں کی چھنک سنکر اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے پانی میں ڈبو کر زور زور سے ملا کرینگی۔ یہ کنواریاں جو کسی کے دولہا بنکر آنے کی راہ دیکھ رہی ہیں ——— کیا جانتے ان میں سے کس کس کے دولہا بنکر آنے والے وہ "خون کی اُس ندی میں ڈوب جائینگے۔ جس کا پاٹ گنیش گڑھ

سے جینت پور تک چوڑا ہوگا ——— اور ان میں سے کئی اس ندی میں ڈوب مریں گی۔ ریاست بھر کی کنواریوں میں سے کتنوں کا یہ حشر ہوگا اور اس کی اناکشی .... وہ گنیش گڑھ کی رانی بنے گی۔ اس کو رانی بنانے ہی کے لئے تو یہ سب کچھ کیا جائیگا۔ وہ اس کی اپنی لڑکی ہے نہ ——— اکلوتی لڑکی ——— اور یہ لڑکیاں ——— یہ ریاست بھر کی لڑکیاں ———؟

.... جن کی چوڑیوں کی سرخی کسی کا خون بن کر بہ جائے گی۔ تاکہ اس کی اناکشی سرخ چوڑیاں پہن سکے ——— اور اسکی سرخ چوڑیوں کی چھنک سنکر ریاست بھر کی جوان لڑکیاں اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے پانی میں ڈبو کر زور زور سے مل لیا کریں ——— اناکشی ریاست کے وزیر اعظم کی لڑکی ہے نہ ——— لیکن کیا وزیر اعظم ریاست بھر کی لڑکیوں کا باپ نہیں ....؟

بوڑھے پردھان کا دماغ دھندلا گیا۔ اس نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ پیچھے پیچھے آنے والے سپاہی گردنیں بڑھا بڑھا کر دیکھنے لگے۔ کہ وزیر اعظم کیوں رک گئے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ دور افق سے پرے کسی آنے والی آندھی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

———(۲)———

پردھان کا گھوڑا پھر بڑھا۔ سامنے ندی کنارے ایک ننھا بچہ مچل گیا تھا۔ اس نے پردھان کا گھوڑا دیکھا۔ تو ضد کرنے لگا۔ کہ میں بھی گھوڑے پر چڑھونگا۔

اور اسکی ماں اُسے دلاسا دے رہی تھی "رو نہیں...... ابھی تیرے باپو آئینگے تو تیرے لئے ایک گھوڑا لائیں گے۔ سونے کا بنا ہوا گھوڑا۔ جو جادو کے زور سے تجھے ان سنہرے بادلوں کی سیر کرایا کریگا"

بچہ سنہرے بادلوں کی جانب دیکھنے لگ گیا۔ لیکن وزیر اعظم اُسی بچہ کی طرف دیکھتے رہ گئے ـــــــ اس کا باپو آئے گا۔ اور سونے کا گھوڑا لائیگا۔

...... لیکن چند ہی دنوں بعد اس کا باپو ـــــــ جنگ میں ـــــــ!

پھر یہ کس کی راہ دیکھا کریگا...... پھر ریاست کے ہزاروں بچے جب اپنی ماؤں سے پوچھا کرینگے۔ کہ باپو کہاں ہیں ـــــــ "تو وہ اُن سنہرے بادلوں کی طرف اشارہ کرکے اپنے آنسو پی جایا کرینگی۔ اور بچے کچھ نہ سمجھ کر اپنی توتلی زبانوں میں پوچھا کرینگے "کیا سونے کا گھوڑا جادو کے زور سے انہیں وہاں سیر کرانے لے گیا ہے ـــــــ میں بھی جاؤنگا ـــــــ اور پھر مچل جایا کرینگے۔ تو وہ کس منہ سے کہا کرینگی ـــــــ رو نہیں ـــــــ ابھی تیرے باپو آئیں گے ـــــــ"

اناکشی کا بھی تو بچہ ہوگا۔ اور وہ بھی سونے کا گھوڑا مانگے گا۔ تو اس کا باپو فوراً سونے کا گھوڑا لادیگا۔ وہ ننھا بچہ سونے کا گھوڑا لے کر کتنا خوش ہوگا۔ اناکشی کے محل میں خوشیاں ناچیں گی۔ اس کی سُرخ چوڑیاں چھنک چھنک جائیں گی۔ اور ریاست بھر کی جوان لڑکیاں اپنے خالی ہاتھوں کو ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر زور زور سے ملیں گی۔ اور یہ چھوٹے بچے۔ جن کے باپو سونے کے گھوڑوں پر چڑھ کر سنہری بادلوں کی سیر کرنے چلے جائیں گے...... ؟ وہ اس خیال ہی

سے کانپ گیا۔ اس کا گھوڑا پھر رک گیا۔ اس کا دل قطعی فیصلہ کرنے سے ابھی جھجک رہا تھا۔ بچہ اب بھی مچل رہا تھا۔ اسکی ماں سوچ رہی تھی۔ کہ "یہ اس وقت چپ کیسے کرے ——" وزیر اعظم سوچ رہے تھے کہ " اسکا مستقبل کیا ہوگا —— ؟"

اچانک وسطِ دریا سے چیخوں کی آواز آنی شروع ہوئی۔ ایک کشتی میں چھوٹے چھوٹے بچے پار جا رہے تھے۔ اس کا کھویا نجانے کس طرح پانی میں گر گیا تھا۔ اور اب کشتی چڑھی ہوئی ندی کی طوفانی لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ اس وسیع اور پر آشوب دریا میں اُنکا کوئی سہارا نہ تھا۔

وزیر اعظم نے یہ دیکھا۔ کہ اسکی آنکھوں کے سامنے اپنی ریاست کے بچوں کا مستقبل آگیا۔ وہ زیادہ دیر یہ نظارہ نہ دیکھ سکا۔ اور اس بات کا ذرہ بھر خیال کئے بغیر کہ اسکے بوڑھے بازوؤں میں وہاں تک پہنچنے کی سکت بھی ہے یا نہیں۔ اور کہ اس کے ڈوب جانے کے بعد انا کشتی کا مستقبل کیا ہوگا اس نے ان بچوں کو بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

افق سے اب تک آندھی کے آثار مٹ چکے تھے۔

---

(۴)

مہاراج مانتے نہیں تھے۔ لیکن پر دھان انہیں مجبور کر رہے تھے۔ کہ وہ بنت پور کی راجکماری سے بیاہ کر لیں۔ نوجوان اور سندر مہاراج نے وزیر اعظم سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔ وہ چھ فٹ لمبا گورا بدن آج جھکا جھکا

تھا۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں بے خوابی کی علامتیں صاف ظاہر تھیں۔ جو زبان محض حکومت کے لہجہ میں بات کرنا جانتی تھی۔ آج اس طرح بول رہی تھی جیسے تھک گئی ہو۔ لیکن آہستگی نے کلام کی روانی پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ وہ روانی جو استقلال کی مظہر تھی مہاراج حیرت کے مارے بت بنے اسکی یہ بات دل میں دہرانے لگے۔ کہ "فرض اور ذمہ داری کا احساس مجھے مجبور کر رہا ہے مہاراج۔ کہ میں آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ کہ صرف ایک آدمی کی خوشی کے لئے ہم ہزاروں بیگناہوں کی جانیں قربان نہیں کر سکتے"۔

مہاراج سوچنے لگے۔ کہ یہ بات وزیر اعظم اپنے منہ سے کیسے کر رہے ہیں۔ یہ شخص جس کی اکلوتی لڑکی میری رانی بننے والی ہے۔ جو یہ جانتا ہے۔ کہ میرے دل سے اناکشی کو اور اناکشی کے دل سے مجھے کبھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور پھر بھی مجھے اناکشی کی طرف سے منہ موڑ لینے کو کہہ رہا ہے بوڑھا پردھان۔ یہ سٹھیا تو نہیں گیا۔ کہیں یہ اناکشی کی شادی کسی اور جگہ تو نہیں کرنا چاہتا۔ اور کیا اناکشی بھی یہ مان جائیگی .... نہیں پردھان کو ہماری محبت کا اچھی طرح علم ہے ——— ورنہ وہ جشن والے دن نوجوانوں کو جنگ کے لئے تیار رہنے کی تلقین نہ کرتا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میری ریاست کا بچہ بچہ میرے لئے کٹ مرنے کو تیار ہے۔ میں اناکشی کے لئے چنت پور تو کیا ہمالیہ سے بھی ٹکرا سکتا ہوں۔

پردھان نے مہاراج کا قطعی فیصلہ سنا۔ تو اسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں

اس کی آنکھوں کے سامنے پنگھٹ پر بیٹھی ہوئی اُن لڑکیوں کا نظارہ آگیا۔ جو کسی کی سُرخ چوڑیوں کی چھنک سُنکر اپنے خالی ہاتھ بہتے پانی میں ڈبوکر زور زور سے ملنے لگ جاتی ہیں۔ پھر وہ بچہ جو اس انتظار میں ہے کہ اُس کا باپو سونے کا گھوڑا لیکر ابھی آئیگا۔ اور بچوّں سے بھری ہوئی وہ ناؤ۔ جس کا کھوّیا دریا میں گم گیا ہے۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ اور راج محل سے نکل آیا۔

---

(۴)

مہاراج نے ایک بار دوبار۔ تین بار اور پھر کئی بار وہ خط پڑھا۔ اُن کا دماغ شل ہوگیا۔ وہ خط ہاتھ میں لئے فصیل پر گئے۔ جہاں سے دور دور تک انکے راج کی وسعتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور انکی آنکھیں کہیں بہت دور جنگلوں میں جانے والے دو مسافروں کی ناکام تلاش کر رہی تھیں۔ جن میں سے ایک الہڑ حسینہ باربار پاؤں میں کانٹے چبھ جانے سے آنکھیں بھر لاتی ہے۔ لیکن اگر اسکے آنسو کانٹوں کی چبھن سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو اسوقت ہی کیوں آنکھوں سے بہ نکلتے ہیں۔ جب وہ کانٹا نکالنے کے بہانے مڑکر پیچھے کو دیکھتی ہے۔

مہاراج کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے ایک بار پھر خط پڑھنا شروع کیا۔ گویا خود وزیر اعظم ایک گمبھیر آواز میں بول رہے تھے۔

" ایک روز انا کشنی مرجائیگی۔ اور آپ بھی۔ لیکن دیش۔ یہ دیش ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اپنے دیش کو اُس لڑکی کے لئے برباد نہ کیجئے۔ جس کی حیات چند روزہ ہے

آپ اس سے برعکس کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمیں واپس چھوڑنا پڑا۔ انا کشی کے ہاتھ بھلے ہی خالی رہیں۔ لیکن ریاست بھر کی جوان لڑکیوں کی سُرخ چوڑیاں چھنکتی رہیں۔ یہی میری پرارتھنا ہے ——"

---

(۵)

شہر کے لوگ آتے تھے۔ اور سر جھکا کر چلے جاتے تھے۔ نامرادوں کو وہاں مراد ملتی تھی۔ سُرخ چوڑیاں پہنے نو بیاہتا لڑکیاں وہاں اسلئے آتی تھیں کہ انہیں اٹل سہاگ ملے۔ کنواریاں وہاں من چاہا بر پانے کے لئے منتیں مانتی تھیں۔ بچے آتے تھے۔ کہ کھلونوں والی دکان سے سونے کا گھوڑا لے جائیں۔ اور تو اور خود مہاراج وہاں سر نواتے آتے تھے۔ اور وہ اُن سب کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا تھا لبوں پر ایک خاموش مسکراہٹ لئے۔ اسکے پاؤں تلے ایک پتھر پر کھدا ہوا تھا "قربانیوں کا ساگر" اور وہ اُن سب پر مسکراتا رہتا تھا۔ ...... بوڑھے پرجاپت کا بت۔ ریاست کے کونے کونے میں اس کی عدیم المثال قربانی کا چرچا تھا۔ عوام کے نزدیک وہ ایک دیوتا بن گیا تھا۔ جس کی منت ماننے سے مرادیں پوری ہوتی تھیں۔ غریب عوام کے پاس کسی کی قربانی کی قیمت ادا کرنے کے لئے عقیدت کے سوا اور ہے ہی کیا —— چنانچہ شہر کے لوگ آتے تھے۔ اور سر جھکا کر چلے جاتے تھے۔ اور وہ ان سب کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا تھا۔ لبوں پہ ایک خاموش مسکراہٹ لئے ——

"تڑاخ" ...... اس زور سے پتھر لگا۔ کہ بت کا ایک حصہ ٹوٹ گیا

——— لوگوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ عقیدتمندوں کی بھویں تن گئیں۔ اور وہ پاگل ایک طرف کھڑا پیروہان کو گالیاں دے رہا تھا۔ ایک وحشت ناک ہیئت کا انسان بے ترتیب داڑھی بکھری ہوئی۔ سر کی خشک اور پریشان لٹوں میں پتے پھنسے ہوئے۔ آنکھیں گویا اپنے خانوں سے باہر گری پڑتی تھیں۔ سب لوگ اسکی طرف چل پڑے ———

وہ وحشیوں کی مانند ہنسنے لگا۔ اور پھر ہنستے ہنستے رو پڑا ——— روتا رہا اور پھر ہنس پڑا۔ غصے سے بھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں جو آیا۔ اُس پہ دے مارا۔ دھول ——— دھپا ——— مُکا ——— لات ——— جوتا ——— ڈنڈا ——— گالی ——— گلوچ ——— غرضیکہ اُس پر ہر طرح کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہ ہنستا رہا۔ اور روتا رہا۔ بت کے لبوں پر اب بھی ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔

مہاراج نے تلملا کر پوچھا ——— "وہ کون ہے جس نے ہمارے دیوتا کی بے حرمتی کی ہے ———" "ایک پاگل ——— مہاراج" مہاراج نے میان سے اپنی تلوار نکال لی۔

"بہلے جاؤ۔ اور اسی کے ساتھ اس کا قلم کر کے لاؤ ———"

پاگل نے ایک خط لکھ کر مہاراج کے پاس لے جانے کو کہا۔ اور خود ہنستا ہوا مقتل کی جانب چلا گیا۔

مہاراج نے پڑھاتے ہیں ہنستا ہوں اسلئے کہ لوگ ایک پاگل کو دیوتا مان بیٹھے ہیں۔ جو دنیا کے جھوٹے فرضوں کے دھوکہ میں اپنی اکلوتی خوشی کا گلا گھونٹ دے۔ وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور یہ جاہل اُسے دیوتا مانتے ہیں ــــــ میں روپڑتا ہوں۔ کہ اناکشی میری غلطی کے باعث گھُل گھُل کر مرگئی۔ وہ کلی پھول بننے سے پہلے میرے سخت ہاتھوں میں کچلی گئی۔ میں اس سے بھی زیادہ سزا کا مستحق ہوں"

مہاراج نے پکار کر کہا "جاؤ اُسے بچاؤ ــــــ"

جو سپاہی مہاراج سے پوچھنے آیا۔ کہ "کسے مہاراج؟" اسکے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا۔ جس میں خون سے لتھڑا ہوا ایک سر لپٹا ہوا تھا۔

لاہور۔ جولائی ۱۹۳۸ء

(یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا جا چکا ہے)

باسٹھ پیسے

سانجھ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لالو کے ٹوکرے میں کچھ پھل بچے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک پھر گئیں۔ خال خال کوئی چلنے والا نظر آتا تھا۔ ان میں سے اسکے پھل کون خریدیگا۔ شاید وہ بابو جو ننگے سر آ رہا ہے۔ وہ اسی کی جانب دیکھتا رہا حتیٰ کہ بابو اسکے قریب آگیا۔ اسکا دھیان دوسری طرف تھا۔ لالو نے زور سے ہانک لگائی۔

"چمن کے میوے ——"

بابو نے ایک بار اسکی طرف دیکھا۔ اور ختم ہوتے ہوئے سگرٹ کا ایک لمبا کش کھینچکر بچا ہوا ٹکڑا وہیں پھینکا۔ اور چلا گیا۔ لالو اُسے دیکھتا رہا۔ یہ بابو کہاں سے خریدتا۔ ایک سگرٹ نوش اگرچہ نیلون پہنے ہوئے ہو۔ اور پھر پیدل چل رہا

ہو۔ اس میں پھل خریدنے کی استطاعت کہاں۔ کلرک طبقہ کی محدود آمدنی کا شخص اگر پھل کھائے۔ تو سگریٹ جیسی لازمی شئے کہاں سے لائے ــــــ"

اتنے میں دو اور آدمی اسکے قریب سے گذر گئے۔ اکبے اُس نے ہانک نہیں لگائی۔ انہوں نے بھی اسکی طرف نہیں دیکھا۔ شاید اندھیرے کے باعث۔ اسکے پاس دیا تک بھی تو نہیں۔ آخر اسکا سودا کسطرح گاہک کی نظروں میں جچے ــــــ" اتنے میں کسی نے پوچھا۔

"آج کیا پھل ہے تمہارے پاس"

"ناشپاتیاں ــــــ" اسکے منہ سے جھٹ نکل گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک میلا کچیلا شخص سر پہ چھابڑی اٹھائے کھڑا تھا۔ چھابڑی میں مٹی کے تیل کا ٹین کا بنا ہوا چراغ دھوئیں کی ایک موٹی لہر ہوا میں چھوڑتا ہوا دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔

"چھن ــــــ ن ــــــ ن ــــــ"

لالو کی چھابڑی میں پیسہ گرنے کی آواز آئی۔ "لو ــــــ ایک پیسے کی دو ــــــ"

لالو نے ہاتھ سے پیسہ ٹٹولتے ہوئے ایک بار پھر سر پر چھابڑی اٹھائے ہوئے گاہک کی طرف دیکھا۔ "پھل کیا ہوگا ــــــ یہ چھابڑی فروش بھی اپنی چھابڑی خالی کر آیا ہے۔ اس کے پاس دھڑ دھڑ جلتا ہوا چراغ ہے نا۔ کیا یہ چراغ ایک رات کے لئے مجھے نہیں دے سکتا۔ اب اسکے کس کام کا۔ لیکن کیوں۔ یہ اپنی چیز مجھے کیوں دے۔ یہ میرا کون ہے۔ وہ اندھا فقیر یہاں ٹھیک ہی

گا یا کرتا ہے۔

"اس جگ میں ہے اپنا کون ——— "میرا بھی کون ہے۔ لیکن چُنّو۔ ہاں چُنّو ہے۔ بیچاری مرنے والی کی نشانی۔ وہی میرے گھر کی لکشمی تھی! اسکے بعد تو ایک روز بھی پورے ڈیڑھ روپے کی بِکری پوری نہیں ہوئی۔ اسکے ہوتے کبھی ایسا ہوا تھا۔ کہ چار چار روز روٹی کھانے ہی کو نہ ملے۔ پھلوں ہی پر گذر کرنی پڑے ——— میرا چنو ہفتہ ہفتہ بھر روٹی کھانے کے لئے مچلتا رہے۔ اور میں اُسے پھل کھلانے پر مجبور رہوں۔ آج اسے ضرور روٹی کھلاؤنگا لیکن .... لیکن یہ پھل جو بچ گئے ہیں۔ میرے پاس بھی چراغ ہو تو رات بھر سینماؤں کے گرد چکر لگا کر تمام پھل ضرور فروخت کر ڈالوں ——— چراغ ...... اسکے پاس چراغ ہے۔ مانگ لوں ——— ؟ اگر ناراض ہو گیا۔ اور اپنا پیسہ لیکر چلا گیا ...... نہیں چراغ مانگنا خطرناک ہے۔ گاہک کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے۔ چھابڑی فروش ہے۔ تو کیا۔ اُن سگریٹ نوش بابوؤں سے تو اچھا ہے۔ مہینہ میں ایک آدھ بار ہی سہی۔ پیسے دو پیسے کے پھل تو کھا لیتا ہے۔ نہیں اس سے چراغ نہیں مانگونگا۔ گاہک سے اُدھار کا بیوپار شروع کرنا اچھا نہیں"۔

اُس نے ایک ناشپاتی اٹھا کر گاہک کو پیش کی۔ لیکن وہاں کون تھا۔ گاہک کب کا جا چکا تھا۔ جانے کب اُسکے ہاتھوں نے نامحسوس طور پر بندھی مشق کے باعث اُسے ناشپاتی دے دی تھی۔

بازار خالی ہو چکا تھا۔ لاڈو نے اپنی چھابڑی سر پر اٹھائی۔ اور اپنی جیب ہی جیب میں پیسوں کو گننے کی کوشش کرتا ہوا چل پڑا۔ آج اُس نے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا۔ کہ جتنے بھی پیسے ایک روپے سے زیادہ ہونگے۔ وہ اپنے اکلوتے چنّو کو روٹی کھلانے کیلئے مخصوص کر دیگا۔ آج وہ چنّو سے پکا وعدہ کر کے آیا تھا اور وعدہ نہ کرتا بھی کس طرح۔ کل شام سے چنّو بھوکا ہے۔ اُس نے پھل کھانے سے انکار کر دیا ہے " ہر روز پھل ہر روز پھل۔ میں اب پھل نہیں کھاؤنگا" اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے یہ فقرہ کہا تھا۔ اور باپ سے چمٹ گیا تھا۔ اسکے سامنے تو نہیں۔ البتہ علیحدہ ہو کر لاڈو خود بھی رو دیا تھا۔ وہ بچے کو یہ یقین نہیں دلا سکا تھا۔ کہ پھل دنیا کی بہترین غذا ہے۔ جس کے لئے امیروں کے بچے گھروں میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ لیکن چنّو کی دلیل بھی قاطع تھی۔ آخر وہ شے بہترین غذا کیسے ہو سکتی ہے۔ جس کے بدلے ایک بدتر کہلانے والی غذا میسّر نہیں آ سکتی۔ ساری دنیا وہی بدتر غذا کھاتی ہے۔ وہ بھی وہی کھائیگا۔ پھل نہیں کھائے گا۔

بچے کی باتیں سنکر لاڈو کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ امیروں کی امارت بھی جب کنگال کے گھر پہنچتی ہے۔ تو افلاس کی دلیل بن جاتی ہے۔

تنور والے کی دوکان کے سامنے ہی بجلی کا کھمبا تھا۔ اسی کے نیچے کھڑے ہو کر لاڈو نے اپنی جیب سے تمام پیسے نکال کر گنے ——— پورے باسٹھ تھے ——— باسٹھ۔ ایک روپیہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ ایک لمحے کے لئے وہ چنّو اور اسکی روٹی کا خیال بھول گیا۔ اُسے کل کی فکر نے آ گھیرا۔ کل ——— کل نئے پھل کہاں سے لائیگا۔

میوہ منڈی میں ایک روپے سے کم والے گاہک کو ٹھوک کے بھاؤ پر پھل نہیں مل سکتے۔ پھر۔ یہ دو پیسے کی کمی۔ یہ کون پوری کریگا۔ کون۔ اُس کا کون ہے وہ نصیر ٹھیک ہی گا یا کرتا ہے۔

"اس جگ میں ہے اپنا کون ——"

کوئی نہیں جو دو پیسے کی کمی پوری کر دے۔ اسکی جس ہتھیلی میں پیسے تھے اُسی پر آنسوؤں کے دو قطرے آپڑے۔ آنسو —— جن کا بے مقصد پانی ہتھیلی کے ایک طرف بہ گیا —— "کاش۔ وہ خون کے دو آنسو ہوتے۔ جو پھیلتے پھیلتے سرخ تانبے کے دو گول ٹکڑے بن سکتے . . . . . ."

تنور والے نے پوچھا "کیا چاہیئے ——" جواب کی بجائے لاڈو نے بھی سوال ہی کیا "آپ کو پھل چاہئیں . . . . ؟"

"ہمارے پاس فالتو پیسے نہیں" تنور والا اپنے کام میں منہمک تھا۔ لاڈو کچھ دیر رک کر بولا —— "دو روٹیوں ہی سے تبادلہ کر لو ——"

"ہا۔ ہا۔ ہا —— ہا ——" تنور والا اپنے کالے ننگے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر قہقہہ لگاتا ہوا کہنے لگا۔

"روٹی سے ہمارا پیٹ بھرتا ہے۔ اِن پھلوں سے نہیں۔"

لاڈو بہت دیر میں گھر پہنچا۔ چنّو ابھی سویا نہیں تھا۔ بھوکے پیٹ نیند کبھی نہیں آتی۔ اُس نے اٹھتے ہی باپ کی چھابڑی دیکھی۔ اور رونی صورت بنا کر پوچھا۔

" آج بھی روٹی نہیں ـــــــــ"

" کیوں نہیں بیٹا ـــــــــ"

" تو کہاں ہے ـــــــــ؟"

لالُو نے اپنی جیب سے باسٹھ پیسے نکال کر بیٹے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ چنّو نے خوشی کے مارے کہا " یہ سب ـــــــــ"

" ہاں۔ یہ سب۔ جتنے چاہے خرچ کر ـــــــــ" بیٹے نے پُر امید لہجے میں پوچھا " اسکے بعد پھر اور ملیں گے ـــــــــ"

لالُو محض اتنا ہی کہہ سکا " اسکے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور پھر وہ ہنس پڑا۔ چنّو نے پوچھا۔

" کیا ہوا باپو ـــــــــ"

" ہوا نہیں ـــــــــ ہوگا "

باہر گھنے بادلوں کے باعث گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا اچانک زور کا کڑکا ہوا۔ بجلی گری۔ اور ایک قریبی درخت اپنی شاخوں سمیت جل کر خاک ہوگیا۔

لاہور۔ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء

بیکار

(ایک تمثیل)

افراد ڈرامہ

نوجوان . . . . ایک تعلیمیافتہ بیکار
کملا . . . . نوجوان کی بیوی
ڈاکٹر . . . . ایک مسافر

پہلا منظر

(نوجوان کے مکان کا اندرونی حصہ۔ کملا ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔
نوجوان کی آمد)

نوجوان ”کملا“ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کملا ”آپ آگئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت دیر کردی“

نوجوان ”آج بہت بھٹکنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے صاحب کی کوٹھی ۔ ۔ ۔ ۔“

کملا ”نہیں۔ نہیں یہاں بیٹھئے“

نوجوان ”نہیں تم لیٹی رہو۔ بیماری میں اٹھنا اچھا نہیں“

کملا ”آپ بیٹھئے تو۔ میں اچھی ہوں“

نوجوان ”ہاں۔ تو میں بڑے صاحب کی کوٹھی پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے یہ کیا۔ پاؤں کیوں دبا تی ہو۔ میں اتنا نہیں تھکا۔ اور پھر پہلے اپنا شریر تو سنبھالو“

کملا ”میرا شریر اچھا ہے۔ آپ سنائیے۔ پھر بڑے صاحب نے کیا کہا“

نوجوان۔ اول تو اسکی کوٹھی کا پتہ ہی نہ ملتا تھا۔ پھر پتہ چلا۔ بہت دور وہاں ماڈل ٹاؤن کے پاس کہیں ہے۔ وہاں جا کر بیٹھا رہا۔ بہت دیر بعد صاحب باہر نکلا۔ میں نے عرضی پیش کر دی۔ اس نے پڑھے بغیر لوٹا دی“

کملا ”پھر۔ آپ ؟ ؟“

نوجوان ”میں نے سن رکھا تھا۔ صاحب سخت تو ہے۔ لیکن دل کا کھوٹا نہیں زبانی عرض کیا۔ صاحب بیوی بیمار ہے۔ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ جیسا ویسا کام ہو۔ وہی دلوا دو“

کملا ”تو کچھ بولا ؟“

نوجوان ”ہاں۔ مجھ سے عرضی لے لی۔ اور بولا۔ تمہارا ضرور خیال رکھیں گے۔ میں شکریہ کہکر چلا آیا۔ دیکھو اسجگہ آبلہ پڑ گیا ہے۔ آہستہ دبانا۔ اُف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں

تم اپنی بتاؤ۔ دن بھر کیسی طبیعت رہی؟"

(کملا خاموش رہتی ہے)

نوجوان:" کملا . . . . "

(وہ پھر خاموش رہتی ہے۔ یہ پھر قدرے زور سے پکارتا ہے۔)

"کملا . . . . "

(وہ پھر خاموش ہے)

"کملا۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ ذرا میری طرف دیکھو. . . . . دیکھو. . . . . یہ کیا؟ تمہارے آنسو۔ کیوں روتی کیوں ہو؟

(وہ پھر خاموش ہے)

"کیا تمہیں یہ کام پسند نہیں۔ یہ تو بہت اچھا کام ہے . . . . . . کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے۔ بولو۔ بولو! تمہیں کیا دُکھ ہے؟"

کملا:" کچھ نہیں ـــــــــــ"

نوجوان:" کچھ تو ہے۔ بتاتی کیوں نہیں؟"

کملا:" آپ نہیں سمجھ سکیں گے!"

نوجوان:" میں نہیں سمجھ سکونگا۔ تو تمہاری بات اور کون سمجھیگا۔ تم بھول گئی ہو کیا۔ کہ میرے سینے میں پیار کرنے والا دل ہے۔"

کملا۔ میری بات سمجھنے کے لئے ایک عورت کا دل درکار ہے۔ عورت بھی وہ جسکا خاوند بیکار ہو! اور ہر چہار طرف سے جسے دوسری عورتوں کے طعنے

سننے پڑتے ہوں "

نوجوان " کملا "

کملا۔ (پھوٹ کر) " نہیں ناتھ۔ مجھے کہیں لے چلو۔ میں یہاں اس طعنوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہ آرام نہیں چاہیئے۔ ان اچھے آدمیوں کے محلوں میں میں اب نہیں رہ سکتی۔ ان لوگوں نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ اور بستر پر طعنوں کے کانٹے بچھا دیئے ہیں۔ تاکہ میں آرام کی کروٹ بھی نہ لے سکوں۔ مجھے لے چلو ناتھ "

نوجوان " لیکن کہاں ۔ ۔ ۔ ۔ کمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے کم پایہ کی اور کون سی جگہ ہوگی "

کملا (جگہ دو ذرا) "اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھول گئی تھی۔ میں یہ بھول گئی تھی۔ کہ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ خود کو بابو لوگوں میں سے سمجھتے ہیں۔ اور بابو لوگوں میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ رہیئے۔ یہیں رہیئے۔ مجھے کوئی دکھ نہیں "

نوجوان " آج تم کیسی باتیں کہہ رہی ہو۔ کمل "

کملا " ایک بات کہوں "

نوجوان " کیا ؟ "

کملا " ہم بابو ہی کیوں بنے رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

نوجوان " کیا مطلب ؟ "

کملا " ہم بابو سے مزدور کیوں نہ بن جائیں۔ کیا ہرج ہے آخر اس بابو پنے میں جوتیاں چٹخانے سے تو مزدوری کہیں بہتر ہے۔ آخر تک آپ کتنے بڑے

صاحبوں سے ملے۔ سب نے ہمارے حال سے ہمدردی ظاہر کی۔ بہت کیا۔ تو وعدہ
بھی کر دیا۔ لیکن کس کس نے وعدہ پورا کیا؟ آپ نے ان صاحب لوگوں کے پیچھے پیچھے
پھر کر جتنی محنت کی۔ جتنی ٹھوکریں کھائیں۔ جتنی جھڑکیاں سہیں۔ اس سے بہت کم
محنت کرتے ہوئے آپ گھر کا خرچ چلا سکتے تھے! البتہ مزدور بنکر۔ پھر اس بابو
پن کے ڈھونگ سے کیا فائدہ؟"

نوجوان: "یہ لوگ کیا کہیں گے ...."

کملا: "تو آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ لوگ جو آپ کو اب "بابو" کہتے ہیں۔ سچے
دل سے کہتے ہیں۔ یقین جانیئے۔ کہ وہ لوگ آپ کو بابو کہتے ہیں۔ لیکن بابو کیطرح
عزت نہیں کرتے۔ مزدور سے بھی برا سمجھتے ہیں۔ اور پھر ہم انکے پاس رہینگے
ہی کیوں۔ مجھے مزدوروں کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہنا منظور ہے آپ
کے پڑھے لکھے ہونے کی جتنی قدر وہ لوگ کرینگے۔ یہاں کے بابو لوگ نہیں کر سکتے
یہ لوگ آپکو "بابو" کہتے ہوئے منہ بسورتے ہیں۔ وہ لوگ بھی آپ کو بابو کہیں گے
لیکن سچے دل سے۔ یہاں سے آپ کی ہزار گنا زیادہ عزت کرینگے۔ آپ سوچیئے
کہ ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہ کر..... چار آنے روز کی مزدوری کر لینے
سے دل کو جو سکون حاصل ہو سکیگا۔ وہ یہاں ہزاروں روپے کما کر بھی نہیں حاصل
ہوگا۔ چلو نا نتھ! ان بڑے آدمیوں کی دنیا چھوڑ کر غریب بن جائیں۔ کوئی
مزدوری۔ دستکاری کریں۔ کوئی آزاد کام کریں۔ نہ نوکری ملتی ہے اور
نہ ہم نوکری کریں؟"

(وقفۂ خاموشی)

مسافر:" تمہیں محنت مزدوری کرنا کس نے سکھایا۔ یقیناً اس نے تمہیں سیدھے راستے پر ڈال دیا ہے۔"

(پھر خاموشی۔ تانگے موٹروں کی آوازیں)

مسافر:" نوجوان "

نوجوان:" جی "

مسافر:" ٹھہرو۔ یہ سامان اتار دو "

نوجوان:" یہ تو سڑک ہے بابو جی "

مسافر:" ہاں سڑک ہے۔ آگے چلنے سے پہلے مجھے یہ بتاؤ۔ کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آئے "

نوجوان:" نہیں تو بابو جی "

مسافر:" چھپاؤ نہیں نوجوان۔ میں نے تمہیں دو تین مرتبہ آستین سے آنسو پونچھتے دیکھا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں کیا تکلیف ہے "

نوجوان:" کچھ نہیں بابو جی چلیئے "

مسافر:" نہیں نوجوان۔ میں آگے نہیں جاؤنگا۔ پہلے یہ بتاؤ۔ تم مزدور نہیں معلوم ہوتے۔ تمہیں ایسا کرنے کو کس نے کہا ہے۔ کیا اس سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے "

نوجوان:" نہیں۔ میری بیوی .... "

(اس کے آگے آواز بھرا جاتی ہے)

مسافر:" تم تو خوش قسمت ہو۔ جو اتنی عقلمند بیوی رکھتے ہو۔ پھر اسمیں

دکھ کی کونسی بات ہے ...... ارے پھر تمہارے آنسو نکل آئے۔ بتاؤ نوجوان تمہیں کیا دکھ ہے؟"

نوجوان "وہ سخت بیمار ہے"

مسافر "بہت سخت ......؟"

نوجوان۔ صبح بیہوش چھوڑ آیا تھا"

مسافر "تو کیا ڈر ہے۔ چلو ہم پہلے اسکو دیکھتے ہیں"

نوجوان "نہیں بابو جی۔ مہربانی"

مسافر "گھبراؤ نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں"

نوجوان "لیکن میں کچھ مزدوری کمائے بغیر گھر نہیں جاؤنگا" (چند سکوں کی چھنچھناہٹ) مسافر "جلدی چلو۔ ایک تانگہ بلاؤ"

تیسرا منظر

(نوجوان کا مکان۔ کملا بیہوش پڑی ہے۔ نوجوان اور ڈاکٹر کی آمد)

نوجوان "کملا۔ کملا میں آگیا ...... اٹھو کمل (اونچی آواز سے) کمل"

ڈاکٹر "اسے اچھی طرح جھنجھوڑو نوجوان"

نوجوان "کمل۔ میں آگیا"

کملا "ہوں ...."

نوجوان "کملا!"

کملا (ہوش میں آکر) "آگئے؟ مزدوری نہیں ملی کیا؟"

نوجوان ۔ "نہیں کمل ۔ یہ دیکھو ۔ مزدوری کما کر لایا ہوں"

کملا ۔ "آپ کما کر لائے ہیں ؟ سچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

نوجوان ۔ "اٹھو نہیں کمل ۔ بیٹھی رہو ۔ یہ لو آج کی کمائی"

(سکوں کی چھنچھناہٹ)

کملا ۔ "ہے بھگوان ! تو کتنا اچھا ہے ۔ (ساتھ ساتھ سکوں کو چھنچھناتی ہے)

موہن کی ماں ۔ آؤ یہ دیکھو میرے پتی دیو کما کر لائے ہیں"

نوجوان ۔ "تم اٹھ کر کیوں بیٹھ گئی ہو ۔ لیٹ جاؤ کمل !"

کملا ۔ "آپ نہیں جانتے ۔ مجھے کتنی خوشی ہے ۔ آپ میرا ایک کام کیجئے ۔ اس پڑوسی مکان میں رہنے والی بڑھیا وہ اوپر والے بابو کی بیوی ۔ ان سب کو بلا لائیے میں آج انکو بتا دونگی ۔ کہ میں اب "بیکار بابو کی بیوی" نہیں رہی ۔ یہ دیکھو میرا خاوند بھی کما کر لایا ہے ۔ آؤ ۔ سب لوگ آؤ آج دیکھو ۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں"

نوجوان ۔ "کمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کملا ۔ "گھبرائیے نہیں ۔ میں اب ذرا بھی بیمار نہیں رہی ۔ میں اچھی ہوں ۔ آپ سب لوگوں کو بلا کر لائیے"

ڈاکٹر ۔ "نوجوان ۔ اسے روکو ۔ ایک دم بہت خوشی کا پیدا ہو جانا اچھا نہیں ہوتا"

نوجوان ۔ "کسطرح روکوں ڈاکٹر صاحب"

ڈاکٹر ۔ "جھٹلا دو ۔ کہ تم کچھ کما کر نہیں لائے ۔ جلدی کرو ۔ اسطرح موت کا اندیشہ ہے"

نوجوان :۔ کمل ۔ کملا ۔ دیکھو یہ غلط ہے ۔ دراصل میں کچھ کما کر نہیں لایا ۔
ان بابو صاحب نے نرس کھا کر دے دیا ہے ۔ مجھے تو مزدوری بھی نہ مل سکی "

کملا :۔ کیا ۔ کیا کہا ۔ مزدوری بھی تمہیں نہیں ملی ۔ اور نرس کھا کر دیئے (آہ کھینچتی
ہے) بھگوان ! ابھی تک بیکار ۔ بھ ۔ گ ۔ وا ۔ ن "

نوجوان :۔ کمل ! ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

ڈاکٹر :۔ بد قسمت نوجوان "

نوجوان :۔ یہ کیا ہو گیا ۔ ڈاکٹر "

(ڈاکٹر ۔ کچھ جواب نہیں دیتا ۔ منہ پھیر کر آنسو پونچھ لیتا ہے)

لاہور ۔ فروری ۱۹۴۰ء

بڑا بھائی

ایک خاموشی پسند ساتھی کی مانند سنسان مگر چاندنی رات نے ایک عالم کو چاندنی کی شراب سے نہلا دیا تھا۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش تھا۔ گو ابھی آغاز شب تھا لیکن چاندنی میں لپٹی ہوئی لیلائے شب کے تیور کچھ ایسے مدہوش کن تھے۔ کہ کوئی بھی ہوش میں نہ رہ سکا۔ سب بیہوشی کی نیند سو گئے۔

گرمی کا موسم۔ شہر کے اس حصہ میں جسے غریبوں کی بستی کہتے ہیں تمام گلی کوچے چارپائیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ پرانی طرز کے ایک دو لمپوں کی مدھم روشنی میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ لباس بوسیدہ، چہرہ بے رونق۔ لیکن چال ڈھال قدرے شاعرانہ، وہ ایک جھونپڑی نما مکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ ایک چارپائی خالی پڑی تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر دو بچے سو رہے تھے ساتھ

سالہ شنی اور دس سال کامرلی دونوں کو میٹھی نیند کی گود میں دیکھکر اسکے بے رونق چہرے پر مسکراہٹ کا ایک خط ابھرا اور مٹ گیا۔ گویا ایک اکیلا ستارہ چمکا اور اسکی روشنی آسمان کی مہیب وسعتوں میں کھو گئی۔

لڑکا آہستہ سے چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اسکی نگاہیں آسمان کے ستاروں میں اٹک گئیں۔ کیا جانے وہ کیا دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے آنکھیں پونچھ لیں اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اسکے آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن وہ سو نہ سکا۔ جب جب وہ آنکھیں بند کرتا تو اسکی بھوکی آنتیں پیٹ میں کلبلانے لگتیں۔ اس نے دو دن کے بھوکے پیٹ کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ "جب چھوٹے بھائی اور بہن نے کھا لیا تو سمجھو میں نے ہی کھا لیا" لیکن پیٹ کا دل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جو وہ ہری شنکر کے جذبات محسوس کرتا۔ بھوکا پیٹ برابر چیختا چلاتا رہا۔ بالاخر وہ مجبور ہو کر آہستہ سے دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے ہنڈیا ٹٹولی، وہ بالکل خالی تھی۔ ہری شنکر کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے پیٹ کو ہاتھ سے دبا لیا۔ لیکن بھوکا شیر کب مانتا ہے۔ ہری شنکر کے لئے اب ایک ہی چارہ تھا کہ وہ زور سے چلائے جب انسان کا کوئی غمخوار نہ ہو تو ایسے موقع پر اسکو تسکین دینے کے لئے قدرت نے کئی بیش بہا موتیوں کو آنسو بن کر ٹپکنے کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

وہ سو رہا ہی چاہتا تھا کہ کئی سال پیشتر کا ایک واقعہ اسکی آنکھوں میں پھر گیا۔ جب موت نے اسکی بیوہ ماں کا دامن تھاما ہوا تھا اور وہ ٹوٹی ہوئی آواز

میں دس گیارہ سالہ ہری شنکر کو سمجھا رہی تھی کہ "یہ چھوٹی بہن اور بھائی اب تمہارے آسرے ہیں۔ دیکھنا بیٹا۔ اب انکی ماں نہ ہوگی جو انکے چاؤ چونچلے دیکھے۔ اب ان کیسا تھ ماں کا لاڈ اور باپ کا پیار تمہیں کو کرنا ہے۔ دیکھنا ماں باپ کی کمی محسوس کر کے یہ ننھے پودے کہیں مرجھا نہ جائیں۔ اور اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو پھر تمہاری ماں نہ ہوگی جو تمہارے لئے اور بھائی جن سکے۔ بیٹا! دنیا میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ لیکن ماں کا پیٹ نہیں ملتا۔ یہ بھی جانتی ہوں، تم خود ابھی ننھے ہو اور تمہیں کس کے حوالے ......" یہاں آکر ماں پھوٹ پڑی تھی۔ آخر میں اُس نے جاتے جاتے محض اتنا کہا تھا "بھگوان تمہیں بوڑھوں جتنی عقل دے"! ماں کی دعا خالی نہ گئی۔ اسکے ان الفاظ نے ہری شنکر کی جوانی چھین لی۔ وہ بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل ہو گیا۔ اس میں شباب کی شوخیاں ظاہر ہی نہ ہوئیں۔ اس کمسنی ہی میں بچپن کی شوخی یا جوانی کے البیلے پن کی بجائے اس میں بزرگوں کی سی متانت اور سنجیدگی آ گئی تھی اسے اپنے "بڑا بھائی" ہونے کا بہت احساس تھا۔ ماں کی خواہش اس کی لوح دل پر کندہ ہو چکی تھیں۔ اور اُسے بر لانا ہی اس نے اپنا ایمان بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنی تمام خواہشات اپنے تمام جذبات اور ولولوں کو چھوٹے بھائی اور بہن کے چاؤ چونچلوں پر نچھاور کر دیا۔ ان کو پہلے کھلاتا۔ خود بعد میں کھاتا۔ چنانچہ آج دو روز سے وہ اسی لئے بہت رات گئے گھر لوٹتا تھا۔ کہ گھر میں محض دو بچوں ہی کے کھانے کے لئے کافی خوراک تھی۔ چنانچہ جب وہ انتظار سے تھک کر خود کھانا کھا کر سو رہتے تب یہ گھر آتا، تاکہ انہیں معلوم نہ ہو کہ بڑے بھائی نے کھانا نہیں کھایا۔ لیکن آج اسکی قوت

برداشت جواب دے گئی تھی، وہ چلّانا چاہتا تھا کہ ماں کے آخری الفاظ اسکے کانوں میں اس زور سے گونجے کہ کلبلاتے پیٹ کی چیخ و پکار ان میں گم ہو گئی۔ جو دل ہاتھوں سے نکلا پڑتا تھا۔ اس نے پھر ڈھارس باندھی۔ اس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر پی لیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا بھی ——— اور پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔

دفعتہً کسی خیال سے چونک کر وہ پھر اٹھ بیٹھا، جیب میں ہاتھ ڈالکر ایک روپیہ نکالا، یہ اس کا آخری اثاثہ تھا۔ ماں مرتے وقت چاندی کے دو چار زیور چھوڑ گئی تھی جو ایک ایک کر کے تمام بک چکے تھے، ایک آخری کڑا جو بچ گیا تھا۔ ہری شنکر آج اُسے بھی بیچ آیا تھا۔ دوسرے روز دسہرے کا تیوہار تھا اور وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے مراری اور نشی دوسرے بچوں کو مٹھائی کھاتے اور کھلونے لاتے دیکھ کر دل مسوس لیں۔ اسکے سامنے محض ایک مقصد تھا کہ ان دونوں کو کسی طرح ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ اُسے آئندہ کی فکر نہ تھی۔ اس وقت اُسے یہ خیال نہ آیا کہ یہ روپیہ ختم ہو جانے کے بعد...... کیا کھائینگے۔ اُسے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ ان بچوں کو روٹی مہیا کرنا کسی بالائی طاقت کا فرض ہے۔

ہوا بھی ایسا ہی، انہی دنوں ہری شنکر کو کسی رئیس کے ہاں ملازمت مل گئی۔ اسکے چھ سالہ بچے کو کھلانے کی۔ اب اسکی قدرے آرام سے کٹنے لگی جتنی کہ نہ جانے کس کونے سے نشی کی جوانی عود کر آئی، نشی کی آنکھوں میں معصومیت کی جگہ اب حیا نے لے لی، وہ اب گھر سے باہر نہ نکلتی، ایک روز ایک امیر زادے نے ہری شنکر کو

راہ چلتے بلا یا اور کہنے لگا "دتشنی کو صبح ہمارے گھر بھیج دینا!" کچھ تعجب اور گھبراہٹ کے عالم میں ہری شنکر کے منہ سے نکل گیا "تمہارے گھر؟ کیوں؟"

امیرزادہ بولا "ماں کہتی تھی کہ چوکہ برتن کرجایا کرے گی ارے بھائی تمہاری کچھ تھوڑی بہت مدد ہو جائے گی"!

جیسے کسی نے ہری شنکر کے دل پہ گھونسا مارا، اس نے امیرزادے کی آنکھوں میں ایک برق آگیں چنگاری چمکتی دیکھی اس چنگاری نے اسکے دل میں آگ پھونک دی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بھول گیا کہ وہ مفلس ہے اور کہ یہ بے عزتیاں اسے وراثت میں ملی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ "بشنی۔ اور میرے ہوتے ہوئے لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کرے"!

رہ رہ کر اس امیرزادے کی آنکھوں کے نفسانی شرارے ہری شنکر کی رگوں میں آگ پھونک رہے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اسوقت ہری شنکر کے ہاتھوں کوئی اثر نظر کبھول نہ ہوا، البتہ وہ کسی طرح موقعہ ٹال کر چلا گیا۔ کاش۔ یہ امیر لوگ کسی غریب "بڑے بھائی" کے سینے میں ہاتھ ڈال کر اسکے دل کو ٹٹول سکتے، اس واقعہ کے بعد ایک نئے غم نے ہری شنکر کا دامن تھام لیا۔ اب وہ رات دن بشنی کی شادی کی فکر میں رہنے لگا۔

مراری بھی اب کام کرنے کے لائق تو ہو گیا تھا، لیکن وہ کرتا دھرتا کچھ نہ تھا بلکہ یوں کہو، کہ بڑے بھائی کی لاانتہا محبت نے اس کو بگاڑ دیا۔ عادات و خصائل میں وہ اپنے بھائی کی ضد تھا، اسے بری صحبت میسر تھی۔ کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے بلکہ خود بشنی نے بھی مراری کی شرارتوں اور زیادتیوں کی شکایت کی،

مگر ہر مرتبہ ہری شنکر لوگوں کو یہی کہتا "بھئی میں سمجھا دونگا" لیکن جب مراری اس کے سامنے ہوتا، تو نہ جانے دل کے کس کونے سے محبت وشفقت کا ایک چشمہ پھوٹ پڑتا۔ جو اپنی رو میں تمام شکوے شکائت بہالے جاتا ہری شنکر کا گلا بند ہو جاتا اور وہ محض اتنا کر سکتا کہ چھوٹے بھائی کو اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی اس میں سکت ہی باقی نہ رہتی ایسے موقعوں پر کئی مرتبہ ہری شنکر کی آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی چمک اٹھتا۔ ان باتوں سے مراری اور بگڑتا گیا۔

ایک روز ہری شنکر خوش خوش گھر لوٹا۔ وہ تمام دن لشنی اور مراری کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے بے تاب رہا تھا۔ چھٹی ملتے ہی وہ بھاگم بھاگ گھر آیا۔ وہ تمام راہ لشنی کی شادی کا تصور باندھتا آیا۔ آج اس نے لشنی کی شادی طے کر دی تھی، انہیں مسرت انگیز خیالات میں غلطاں جب وہ گھر پہنچا تو اس نے لشنی کو چشم براہ پایا۔ وہ دروازے کی آڑ میں سے اسی کی راہ تک رہی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تھے جو محض ہری شنکر کی آمد کے منتظر تھے۔ اسکے آتے ہی وہ بھی لشنی کے دل کی مانند قرار کھو کر پھوٹ پڑے۔ ہری شنکر نے فرطِ استعجاب میں پوچھا "لشنی کیوں ؟" لشنی نے کہا "مراری......" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی، البتہ کلمہ پورا کرنے کے لئے آنسو آنکھوں سے نکل آئے، ہری شنکر نے مضطرب ہو کر پوچھا "کہاں ہے مراری......"

لشنی نے اندر کی طرف اشارہ کیا، وہ بجلی کی مانند اندر آگیا مراری اوندھے منہ

پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ہری شنکر کو سارا معاملہ سوجھ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مراری آج شراب پی آیا تھا۔ یہ اسکی بُری صحبت کا حاصل تھا ہری شنکر کا چہرہ ایکبارگی تمتما اٹھا۔ اُس نے کہا "اسیطرح پڑا رہنے دے اسے پانی تک نہ پوچھ۔" لیکن نجانے کیوں وہ خود اس پر عمل نہ کر سکا۔ کبھی وہ بھائی کا سر سہلاتا اور کبھی تلوے، اسیطرح اس نے تمام رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔

اس واقعہ کے بعد مراری اور کھل کھیلا، یہ واقعہ اسی قسم کے مسلسل واقعات کا آغاز ثابت ہُوا۔ حتیٰ کہ مراری کا شراب پینا مستقل ہو گیا۔ بھائی کی تمام کوششوں کا نتیجہ اگر کچھ ہُوا تو یہ کہ مراری نے شراب کے ساتھ ساتھ جوا بھی شروع کر دیا۔ اور جوئے کا لازمہ عیاری بھی اس میں آموجود ہوئی، ہری شنکر ان باتوں کو دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتا۔ اُس نے مراری کو سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ریت میں پانی نے اثر کرنا تھا نہ کیا۔

ہری شنکر نے کسی نہ کسی طرح لشنی کا بوجھ اتارنے کا بندوبست کیا۔ سسرال جانے وقت لشنی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بھائی سے کہا۔ بھیا" مراری کا کیا بنے گا!" ہری شنکر نے اسکی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا:۔

"اس کا کیوں فکر کرتی ہو" لشن۔ وہ سدھر ہی جائیگا اور پھر اس کا بڑا بھائی جو موجود ہے، جب تک میں ہوں، تم دونوں کیوں فکر کرو۔" ہری شنکر کے سر پہ جو سب سے بھاری بوجھ تھا۔ لشنی کے سسرال جانے پر وہ ہلکا ہو گیا۔ اب یہ

گئیں مراری کی اداباشیاں اور ہری شنکر کی اپنی ذات ۔

ایک ضروری امر کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ کی ستم ظریفیوں نے ہری شنکر کی شوخی چھین کر اُسے سنجیدہ متین بنا دیا تھا ۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ کہ وہ نوجوان تھا ۔ اور ایک شاعرانہ دل رکھتا تھا ۔ اور ایک نوجوان دل پر جو گذرا کرتی ہے وہ اس پر بھی بیت چکی تھی ۔ اس کا دل بھی کسی کی زلفوں کے پیچ میں کھو گیا تھا ۔ وہ بھی کسی کے رخ پر نثار ہو چکا تھا ۔ یہ علیحدہ بات ہے ۔ کہ واقعات کے اُلٹ پھیر نے اس کے عشق میں سرگرمی نہ پیدا ہونے دی ۔ اور نہ ابھی تک اس کی بُو ہی پھیلنے پائی ۔ لیکن اس ظاہری بے رنگی نے اندرونی طور پر اس کی محبت کو اس قدر گہرے رنگ سے رنگ دیا تھا کہ کئی سیلِ حوادث بھی اُسے نہ دھو سکیں ۔ وہ دن کے وقت دکھائی دینے والے آسمان کی مانند تھا جس کے سینے میں سینکڑوں ارمانوں کے داغ ستاروں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں ۔ لیکن بظاہر نظر نہیں آتے ۔ اس کی انتہاہ محبت پر سنجیدگی کچھ اس طرح پردہ کئے ہوئے تھی ، جس طرح کسی گہرے سمندر کی خاموش سطح ۔ جس کے پردے میں ہزاروں لہریں تمناؤں کی مانند اٹھ رہی ہوتی ہیں ۔ جیسکے دل میں کئی پرشور طوفان اٹھتے ہیں اور دل ہی میں بیٹھ جاتے لیکن سطح پر ایک لابدی سکون ظاہر ہوتا ہے ۔

غرضیکہ اُسے چمپا سے عشق تھا ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک سنجیدہ شخص کا عشق کس قدر پختہ ہوتا ہے ۔ چمپا ایک غریب گھسیارے کی لڑکی شہر سے باہر ایک جھونپڑے میں رہتی تھی ۔ جہاں ہری شنکر ہر روز اپنے ننھے مالک کو

گاڑی میں بٹھاکر ہواخوری کے لئے لے جاتا۔ اس نے چمپا سے شادی کی ہوتی لیکن آجتک بڑے بھائی کا فرض چمپا اور اسکی شادی میں مانع تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا، کہ لشمی کی شادی کا مقدس فرض پورا کئے بغیر وہ شادی کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن اب اس نے چمپا کے ساتھ اپنے دامن کی گرہ باندھنے کی بات طے کر لی۔ اسکے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی، دونوں کے پاس محبت کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جوں جوں مقررہ روز نزدیک تر ہوتا گیا۔ ہری شنکر کے تصور کے سامنے نئی نئی دنیائیں آباد ہوتی گئیں۔ کئی مرتبہ وہ آئندہ زندگی کے تخیل میں کھو جاتا، چمپا کا خیال ایک نشہ تھا جو رفتہ رفتہ اس پر چھا گیا۔ لیکن واقعات کے ایک ہی چکر نے اسکی شراب میں نمک گھول دیا۔

ایک روز اس نے مراری اور اسکے اوباش دوستوں کو باتیں کرتے سنا وہ لوگ اُسے بھڑکا رہے تھے اور ہری شنکر کے کانوں میں مراری کے یہ الفاظ پڑے" ہاں۔ بھائی کو میری کیا فکر اُسے تو اپنی شادی کی دھن سما رہی ہے میری ماں ہوتی تو کوئی میرا بھی خیال رکھتا"۔ یہ الفاظ سُن لینے کے بعد ہری شنکر کی حالت بعینہٖ اس خرمن کی مانند تھی۔ جس پر ابھی ابھی بجلی گری ہو۔ وہ اُس ہرنی کی مانند تڑپ اٹھا۔ جس کے بچے کو شکاری کے تیر نے موت کا پیغام سنا یا ہو۔ اس روز وہ ماں کی تصویر کے سامنے دل کھول کر رو دیا۔ اس نے بلک بلک کر ماں سے کہا" تم بتاؤ ماں! میں نے کس دن مراری کا خیال دل سے بھلایا، کس دن اس کو کھلانے سے پہلے خود کھایا۔ کیا میں نے اسکو ذرہ بھر

تکلیف سے بچانے کے لئے اپنے سر پر پہاڑ نہ اٹھائے؟ کیا میں نے اسکے تمام ناز برداشت نہ کئے؟ کیا میں نے اس کے دل کو کوئی ٹھیس پہنچنے دی؟ کیا میں نے وہ کچھ نہ کیا، جو شاید تم بھی نہ کر سکتیں۔ تب۔ تب کیوں اس نے ایسا کیا.......... ماں!......... تم نے مجھے بڑا بھائی کیوں بنایا؟"
ماں کی تصویر نے سمجھانے ہری شنکر سے کیا کہا البتہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہری شنکر کی شادی یک لخت کیوں رُک گئی، اب ہری شنکر کے سینے میں ارمانوں کی ایک خاموش آگ دبی ہوئی تھی۔

اب ہری شنکر مراری کے لئے کسی لڑکی کی تلاش میں تھا۔ انھی دنوں ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس نے بساط ہی اُلٹ دی۔ اس نے سنا کہ مراری اب کہتا ہے کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ جو ہری شنکر نے اپنے لئے تلاش کی ہے۔ ہری شنکر کی برداشت کی حد ہو گئی۔ اس کا رشتۂ صبر اس قدر تن گیا کہ اب اس میں لچک کی مطلق گنجائش نہ رہی۔ اس نے مراری کو سمجھایا۔ لیکن جہاں تک سمجھ بوجھ کا جادو چلتا ہے، مراری تو ان حدود کو پار کر چکا تھا۔

ہری شنکر نے بھائی کے پاؤں پکڑ لئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک عاجز گداگر کی مانند بھیک مانگی "مراری میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم مجھ سے میری جان لے لو۔ لیکن یہ مطالبہ نہ کرو" مراری یہ نہ جان سکا کہ بھائی نے اس ایک فقرہ میں اپنی محبت، برادرانہ رشتے اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کا واسطہ دیا ہے، آخر وہ سمجھتا بھی کیونکر۔ قدرت نے اسے بڑا بھائی

نہ بنایا تھا۔ اس نے ناپائیدار نفس کی خاطر اس شئے کو رد کر دیا جس کا پلہ بہشت کی رحمتوں پر بھی بھاری ہے، اس نے بڑے بھائی کی محبت ٹھکرا دی۔

مراری کا رویہ دیکھکر ہری شنکر نے خیال کیا شائد سخت الفاظ سے کام نکل آئے، چنانچہ وہ اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر کسی کام کو چلا گیا۔ واپس لوٹا تو ایک چھوٹے سے لڑکے نے اُسے بتایا کہ آج مراری بھیا نے بہت شراب پی ہے اور ایک چاقو لے کر یہ کہتا ہوا کہیں چلا گیا ہے کہ اگر وہ مجھے نہیں دیتا تو میں اسکے لئے بھی نہ چھوڑونگا۔

ہری شنکر کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے سوچا کہ نشے میں بدمست مراری سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اُس میں کھڑا رہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ جانے کس طرح ہوا کے پر لگا کر بھاگا۔ راہ میں وہ دل کو ڈھارس بندھاتا گیا کہ "مراری کچھ بھی ہو۔ آخر میرا بھائی ہے وہ اتنا کبھی نہیں کر سکتا" چمپا کے جھونپڑے کے قریب پہنچکر اس کے پاؤں من من کے ہو گئے۔ اس کا دل طوفان زدہ کشتی کی مانند جھکولے کھانے لگا۔ وہ جھونپڑے میں داخل ہی ہونے لگا تھا کہ مراری باہر نکلا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئے۔ مراری کی نیچی نگاہوں سے ہری شنکر سمجھ گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ ندی کے طوفان زدہ کنارے کی مانند وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اسوقت اس کے دل پر جو بیت رہی تھی اس کو بیان کرنے کا نہ قلم کو یارا ہے اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ سمجھ لیجئے، کہ ایک لمبا سنکا تھا

جس کے سینے کو کئی شکاریوں کے چھوڑے ہوئے تیروں نے ایک ساتھ آکر شق کیا ہو۔ اور اس پر ستم یہ کہ اسکی جان اٹک گئی ہو۔ ادھر مراری کی یہ حالت تھی کہ قتل جیسا خوفناک جرم کرنے کے بعد اس کا تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ یہ فطرت کا تقاضا تھا کہ اسوقت اس کے دل میں وہ خفتہ جذبات سر اٹھا رہے تھے جن کو بیدار کرنے کے لئے بڑے بھائی نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی۔ لیکن یہ اسوقت ہوا۔ جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہری شنکر نے محض اتنا کیا کہ مراری کو ماں کی تصویر کے سامنے لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس چوٹ نے ہری شنکر کے جذبۂ احساس کو سن کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھے۔ نہ لب پر آہ۔ ہری شنکر نے ماں سے صرف اتنا کہا "تم نے دیکھا ماں۔ مراری نے کیا کیا۔ اب یہ امانت مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ اسے تمہیں واپس سونپتا ہوں مجھے بڑے بھائی کے فرائض سے سبکدوش کر دو۔"

ان دو مختصر فقروں نے مراری کی آنکھوں کے سامنے بھائی کی محبت کا وہ باب کھول دیا جس کا خاتمہ نہ تھا۔ اس کے دل نے اس پر پھٹکار ڈالی۔ اس نے چاہا کہ ایک بار پھر ہری شنکر اسی طرح محبت بھرے الفاظ میں اسے سمجھائے لیکن وقت بیت چکا تھا۔

ہری شنکر نے عدالت میں خود خونی ہونے کا اقرار کیا۔ مراری کا ضمیر یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بھی عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہری شنکر نہیں۔ وہ خونی ہے۔ عدالت عجب مخمصے میں پھنس گئی۔ بگڑا ہوا مراری اب

بن چکا تھا۔ وہ بیچ راستے پر آچکا تھا۔ فیصلہ سنانے میں کئی روز لگ گئے۔ عدالت
کوشش کرنے پر بھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ دونوں بھائی کسی خوفناک گہرائی
والے سمندر کی مانند سنجیدہ تھے، دونوں کے دلوں میں کیا جانے کیا کیا مدو
جزر ہو رہا تھا۔ ایک روز موقعہ ملا تو ہری شنکر کھلا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے
کہا: "مراری۔ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ مجھے تباہ کیوں نہیں ہونے دیتے"
مراری برداشت نہ کر سکا۔ وہ بھائی کے قدموں میں گر گیا اور روتے ہوئے
کہنے لگا "میرا گناہ بخش دو بھیا" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بھائی کے
اشکہائے ندامت دیکھکر بڑے بھائی کا ضبط بھی ٹوٹ گیا۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے
نالے کی مانند بہ نکلا۔ روتے روتے اس نے بھائی کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔
اسے جی بھر کے پیار کیا اور بولا "شاباش! تم سے ایسی ہی امید تھی۔ کیا آج
بھی تم "بڑے بھائی" کی ایک درخواست قبول نہ کرو گے" مراری بولا "درخواست
نہیں۔ بھائی۔ تم حکم کرو۔ تمہارا ہر لفظ میرے لئے قانون ہے" ہری شنکر
نے آہستگی سے جواب دیا "تو مجھے مر جانے دو" مراری کا دم تک رک گیا۔ بڑا
بھائی کہتا گیا "مراری۔ آج پہلی مرتبہ "بڑے بھائی" کی درخواست منظور کرو
اب مجھے اور زیادہ تکلیف نہ دو۔ موجِ خوں میرے سر سے گزر چکی ہے اب مجھ
میں زندگی کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں۔ میرے چپو توڑ دینے
کے بعد اب میری کشتیِ حیات کو طوفان میں نہ دھکیلو۔ اسکے ڈوب جانے ہی میں
راحت ہے۔ میں تم سے زندگی بھر کی محبت کے صلے میں صرف موت کی بھیک مانگتا
ہوں" مراری جانتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے جھونپڑے کو آگ لگا رہا ہے۔ اپنے

ہی تیر سے اپنا سینہ چھید رہا ہے۔ لیکن آج وہ اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا کہ جہاں بڑے بھائی کے حکم سے نافرمانی کرنے کی مطلقاً گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ بڑے بھائی کی خواہش پوری کر کے اسکی زندگی بھر کی محبت کا صلہ چکا دیا اور یہی ایک خیال کہ اس کا چھوٹا بھائی آخرکار فرمانبردار نکلا۔ پھانسی کے تختے پر بھی بڑے بھائی کو تسلی دے رہا تھا۔

لاہور۔ مارچ ۱۹۴۰ء

(یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ کیا جا چکا ہے)

چھوٹا بھائی

کمل نے الماری سے ایک کتاب نکالی لیکن یہ دیکھے بغیر کہ وہ کون سی
ہے حقارت کے ساتھ پرے کونے میں پھینک دیا۔ اسی طرح ایک ایک کر کے فرش کے ا
سرے سے اس سرے تک کتابوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر جمع ہو گیا۔
کتابوں کی یہ بے ترتیبی ——— اور اسکے دل کی پریشانی ——— ا
یکسانیت سے گویا اسے ایک گونہ شانتی کا احساس ہونے لگا۔ وہ قریب پڑی
کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسکی نگاہیں کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی چنار کی ٹہنیوں کو چیر کر
کھڑے صنوبر کی چوٹی پر اٹک گئی تھیں۔ اسی کے نیچے وہ بیٹھی تھی۔ شاید اسی کے ا
کی انتظار میں ——— لیکن نہیں وہ تو اس وقت بڑے بھیا کیسا تھ ہنسی ٹھٹھے
میں مشغول ہو گی . . . . . بڑے بھیا۔ آخر یہ اسطرح ہر وقت اس پر تاجا

تسلط کیوں جمائے رکھتے ہیں ...... امی کسم سے دو چار باتیں بھی نہ کی ہونگی کہ جناب نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے" ـــــ کمل ـــــ او کمل کہاں چلا گیا" ـــــ اور پھر ـــــ "تمہیں شرم نہیں آتی اکیلے میں جوان لڑکیوں کے دیا بیٹھ کر باتیں کرنے جا ـــــ جا کر پڑھ ـــــ" گویا اس کے لئے کسم سے بات کرنا گناہ ہے۔ گناہ کبیرہ۔

تو پھر دیو کمار اُسے یہ اپدیش سُنا کر خود کیوں اُسی کسم کے پاس چلا گیا۔ اس کے لئے کسم سے ہنسی ٹھٹھا گناہ نہیں؟ کیا محض ایک سال پہلے دنیا میں داخل ہو جانے سے ہر وہ بات جو اسکے لئے گناہ کبیرہ ہے۔ بڑے بھائی کے لئے کار ثواب بن گئی ہے۔ ثواب عظیم ـــــ ا محض ایک سال کے ہیر پھیر سے کس قدر الٹ پھیر ہو سکتا ہے۔ سچ ہی تو ہے۔ اُس روز گنیش گھاٹ والے راج جوتشی بھی تو یہی کہتے تھے۔ کہ ایک پل کے ہیر پھیر سے وہی ستارہ بلائے عظیم ثابت ہو سکتا ہے اور وہی ایک سعادت عظمےٰ ـــــ اور یہاں تو ایک سال کا فرق ہے۔ ایک سال ـــــ ایک سال تھوڑا ہوتا ہے؟ اس میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا یہی دیکھئے نہ، ایک سال پہلے آکر دیو کمار نے ہر اچھی چیز اپنے لئے ریزرو کرالی ہے۔ دونوں کے حالات میں کس قدر فرق ہے اسکے لئے تمام دن کمرہ میں بند رہ کر کتابوں کا کیڑا بننا لازمی ہے۔ اور بڑے بھائی کیلئے پڑھائی اتنی ہی غیر ضروری ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہر کام کی طرح امتحان کے کمرہ میں بھی وہ ہانک لگائیں گے "ا تا کمل۔ ذرا یہ سوال تو حل کر جانا۔ ارے وہاں کیا کر رہا ہے کمبخت ابھی تک اپنا پرچہ بھی حل نہیں کر سکا۔ اسی لئے سارا سال کہتا رہا ہوں کہ پڑھ۔ پڑھ......"

لیکن امتحان کے کمرہ میں انہیں یہ سب کچھ کہنے ہی کون دیگا وہاں گھر تھوڑا ہے۔ کہ بات بات پر کمل کو طلب کیا جا سکے۔ آخر یہ بڑے بھائی اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں —— سردیوں میں کئی بار وہ سخت حاجت کے باوجود اپنی گرم کی ہوئی نشست کو چھوڑ کر پیشاب تک کرنے نہیں جاتا۔ لیکن بڑے بھیا ہیں کہ انکی آواز پر اگر کوئی نوکر حاضر نہیں ہوا۔ تو دیتے ہیں کمل کو آواز۔

"جانا کمل۔ ذرا پانی تو لانا —— آنا —— میری الماری سے وہ کاپی تو نکال دو۔ . . . . . " وغیرہ۔ اور اگر کمل رتی بھر آنا کانی کرے۔ تو کونسا بڑا نام ہے۔ جو اسکے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ کبھی ریڈیو پر کوئی اچھا سا گانا ہو۔ یا کوئی اور دلچسپ محفل ہو۔ اور کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ تو انکی نگاہیں آخر چھوٹے بھائی کو ڈھونڈ لیتی ہیں۔

اور یہ سب کچھ محض ایک سال کے ہیر پھیر کے باعث۔ راج جوتشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کہ ایک پل کے ہیر پھیر سے وہی ستارہ بلائے عظیم بن سکتا ہے اور وہی ایک سعادت عظمیٰ —— ستارے۔ یہ ستارے بھی انسان کی زندگی کو کسطرح اتھل پتھل کر سکتے ہیں —— یہ خوبصورت . . . . . . ظالم . . . . . . ستارے۔ کسم بھی ایک ستارہ ہے —— نہیں بلکہ وہ تو ایک چاند ہے —— پورنیما کا چاند۔ کیا اُس پر بھی دلیو کمار کے ستارہ کا سایہ پڑ جائے گا۔ کیا اُس پہلے سال میں دلیو کمار نے کسم کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا"

اس خیال ہی سے وہ سہر اٹھا۔ وہ جیسے بوکھلا سا گیا۔

" کیا ہر جگہ میرا چھوٹا پن مجھے اسکے ہاتھوں شکست دلائیگا —— زندگی

کے ہر مرحلہ پر وہ اسیطرح مجھ پر غالب رہے گا؟ گھر میں ——— کالج میں ——— میری آئندہ زندگی میں . . . . اور کسم . . . . . . ؟ کیا کسم کے معاملہ میں بھی وہ مجھے پیچھے چھوڑ جائیگا . . . . نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا ——— میں اسکے بنا مرجاونگا . . . ."

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو دبالیا۔ جیسے وہ پھٹنے والا ہو۔ وہ اس خیال کو بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا چہ جائیکہ حقیقتاً ایسا ہو جائے ——— اُس نے اپنے دل میں طے کرلیا۔ کہ وہ کسم سے اس بارے میں دو ٹوک جواب طلب کریگا۔ . . . . ابھی ——— اسی وقت۔

کمل بکھری ہوئی کتابوں کو روندتا ہوا باہر نکل آیا۔ لیکن کسم کب کی اپنے باپ کے ساتھ واپس اپنے گھر جاچکی تھی۔ کمل گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ حضوری باغ کی نکڑ پہ پہنچا تو سامنے سے کلوا گوجر دودھ کی مٹکی اٹھائے آرہا تھا۔ غالباً انہی کے ہاں جارہا تھا۔ یہ بھی تو بڑا بھائی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی کہیں سے ایک لڑکی لے آیا تھا۔ لیکن اُسے اس نے اپنے گھر بسالیا ہے۔ پرسوں روز ماں کو سارا قصہ سنا رہا تھا۔ "اجی وہ رامو ہے تو میرا ہی چھوٹا بھائی ——— لیکن ہے بڑا بدماس۔ کہوے تھا۔ کہ اس چھوکری کو مجھ سے اِسک ہے۔ بھلا آپ ہی بتاؤ۔ وہ ذرا سی جان وہ اِسک وِسک کیا جانے۔ میں نے مرے ماں باپ کی لونڈیا جان کے گھر بسالی تو سُسرے نے جانے اُسے کیا پٹی پڑھادی۔ پھر بگڑ بیٹھی۔ بس ایک ہی بار ڈنڈا برسایا ہے اُس دن سے سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا ہے کیا بتاؤں۔ بلائیں وہ سہیڑ لاتا ہے۔ سمیٹنی مجھے پڑجاتی ہیں"

اُس کی یہ پا کارانہ باتیں جب بھی کمل کو یاد آجاتی ہیں۔ تو اُس کا خون کھول اٹھتا ہے "یہ بڑے بھائی —— جن کی ہر برائی بڑپن کی موٹی تہ کے نیچے چھپ جاتی ہے۔ جو بڑپن کی آڑ میں اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کر لیتے ہیں، اور پھر ستم یہ کہ اسکے لئے نہ صرف داد طلب کرتے ہیں۔ بلکہ ان حرکتوں کیلئے چھوٹوں سے شکریہ کے طالب رہتے ہیں"

کمل کو زور کا دھکا لگا۔ وہ ایک سائیکل سے ٹکرا گیا تھا۔ سائیکل سوار نہایت چڑ چڑ ہوا "اونٹ جتنے بڑے ہو گئے ہو۔ اور ابھی تک سڑک پر چلنا نہیں آیا"
کمل کے منہ سے حیرانگی کے مارے نکل گیا "بڑا ——؟" وہ جاتا جاتا جواب دے گیا "نہیں بڑے کاہے کو —— ابھی تو خیر سے چھوٹے بچے ہو۔ ننھے منے۔ پھر سڑک پر کیا کرنے آتے ہو۔ جاؤ ماں کی گود میں بیٹھو ——"

وہ چلا گیا۔ کمل سوچتا ہی رہ گیا "گویا چھوٹوں کیلئے سڑک پر چلنا بھی ممنوع ہے۔ یقیناً یہ سائیکل والا بھی کسی کا بڑا بھائی ہوگا۔ ان بڑے بھائیوں نے آخر ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے .. نہیں جانتے۔ کہ ہمیشہ سے چھوٹے بھائی ہی عظیم ہستیاں بنتے آئے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ لکشمن، بھرت، نپولین، حضرتِ یوسفؑ۔ یہ تمام آخر چھوٹے بھائی ہی تو تھے"
سامنے ایر کنڈل کے بازار میں ایک نوجوان لکڑی کے ایک ڈنڈے پہ نقلی سلک کی نکٹائیاں لٹکائے بیچ رہا تھا۔ اس نے شاید دو سال ہوئے بی اے پاس

کیا تھا۔ اس نے نکٹائیاں کمل کے آگے کر دیں۔ کمل ٹھٹھک گیا۔ اور اُسکے منہ کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ البتہ ایسی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ دکس کُسم کے پیچھے جا رہے ہو کمل بابو۔ ایک نئی نکٹائی خرید لو۔ تمہاری نکٹائی پھٹ گئی ہے۔ تمہیں اُس وقت کُسم سے زیادہ نئی نکٹائی کی ضرورت ہے پھر ایک کیا کئی کُسم تمہیں دستیاب ہو سکتی ہیں ارے دیکھتے کیا ہو۔ خریدتے کیوں نہیں۔ میری پھٹی ہوئی نکٹائی دیکھ رہے ہو ؟ میں جب کالج میں پڑھتا تھا۔ تو ہر روز نئی نکٹائی لگایا کرتا تھا۔ اب بھی مجھے کہیں کلرکی مل جائے دو اگر آدھی تنخواہ ہر ماہ نکٹائیوں پر خرچ نہ کروں تو کہنا۔ تمہیں کم از کم ایک تو ضرور خرید لینی چاہیئے۔ بڑے بھائی سے ڈرتے ہو۔ یہ کُسم نہیں کہ وہ اُس پر بھی قبضہ کر لے ــــــ"

کمل چونکا۔ نکٹائی فروش اب تک بالکل خاموش کھڑا تھا۔ کمل نے اُسے غور سے دیکھا۔ اسکے دونوں موٹے لب جیسے کسی انجان موچی نے سی دیئے تھے۔ جن میں کتنی سلوٹیں رہ گئی تھیں۔ تو پھر یہ بات کس نے کہی تھی۔ کمل سمجھ نہ سکا اور خاموشی سے سر جھکا کر پھر چل پڑا۔ اس نے پل پار کیا۔ اس پار کا بازار بند ہو رہا تھا۔ پرتاپ باغ کے قریب کئی بدصورت مرد خوبصورت عورتوں کے ساتھ سیر کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ کتنے بے جوڑ جوڑے ہیں۔ جب کُسم کے ساتھ میری شادی ہو جائیگی۔ اور ہم بھی سیر کرنے نکلا کرینگے۔ تو کئی عورتیں ہمیں حسد سے دیکھا کریں گی۔ نہیں۔ ہم اسطرف کبھی سیر نہیں کیا کرینگے۔ سنا ہے عورتوں کی نظر بہت بُری ہوتی ہے۔ ہم ٹنکمرگ باغ کی طرف جایا کرینگے

وہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ وہاں ہیں اور کسم۔۔۔۔۔۔" قریبی جھاڑی میں سے اچانک کوئی زور کا قہقہہ مار کر ہنسا۔ وہاں چند کالبجیٹ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کمل کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی چھوٹے بھائی کے ان خوابوں کو سنکر جو کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ کوئی بڑا بھائی ایک طنزیہ قہقہہ لگائے۔

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ اس نے ٹھیک ہی قہقہہ لگایا ہے آخر مجھے کسم کے بارے میں یہ سب کچھ سوچنے کا حق ہی کیا ہے۔ وہ میری کون ہے۔ اور جو کچھ میں اسے پوچھنے جا رہا ہوں۔ یہ پوچھنے کا بھی مجھے کیا حق ہے یہی کہ وہ مجھ سے ذرا ہنس بول لیتی ہے۔ میری ہر بات میں بہت دلچسپی لیتی ہے۔

یہ مرد لوگ بھی کس قدر خطرناک قوم ہوتے ہیں۔ ذرا کسی عورت نے ان سے دلچسپی کا اظہار کیا نہیں۔ اور بس وہ اسکے سر پر سوار ہونے کے درپے ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

کمل یہ باتیں سوچتا رہا۔ رکا نہیں اور کسم کے گھر پہنچ ہی گیا لیکن کسم کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ نوکر سے اتنا سنکر باہر سے ہی پلٹ آیا۔

"ہاں وہ میری کون ہے۔ جو میرے آنے کا انتظار کرتی۔۔۔۔۔" اُسے اندر ہی اندر ایک بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اُسے کہیں تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ ٹھیک ٹھیک تجزیہ نہیں کر سکا کہ اُسے کس جگہ تکلیف ہو رہی ہے۔

سامنے کی دوکان پر "ڈاکٹر چندر مُنی" کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے نیچے ڈگریوں کی جگہ انگریزی کے تمام حروف تہجی لکھے ہوئے تھے سوائے ایم۔ بی۔ بی۔

ایس یا ایل۔ ایس۔ ایم۔ الف کے۔کمل دوکان کے اندر چلا گیا۔" کہیئے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے ------؟"

کمل نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکا وہ کیا بتاتا۔ کہ کہاں اور کیا تکلیف ہے۔ ڈاکٹر نے فوراً اٹھ کر کھلے منہ کے اندر کچھ دیکھا۔ اور کہنے لگا۔ "گلا یقیناً بہت خراب ہو رہا ہے۔ لیجئے "تھروٹ پینٹ" لگائے دیتا ہوں۔ دیکھئے جنتک لعاب بہتا رہے۔ تھوکتے رہیئے ------"

"تھوکوں گا کہاں ------"

"اجی وہیں۔ اسی کونے میں تھوک لیجئے نا ------" کمل اسی کونے کی جانب منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اس کے عین سامنے ڈاکٹر صاحب نے موٹے موٹے حروف میں لکھ رکھا تھا۔ "تھوکنے والا حوالہ پولیس کیا جائیگا" لیکن یہ تو ملازموں پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔ ورنہ مریضوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یوں بھی انکے ہاں مریض کبھی کبھار آتا تھا۔ وہ اسے ایسی معمولی بات کے لئے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کمل اسی کونے میں تھوکنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اسکے دماغ میں مختلف واقعات گھومنے لگے۔ "وہ سائیکل سوار جو چھوٹوں کو سڑک پر چلنے کی اجازت بھی دینے کو تیار نہیں۔ وہ کلوا گوجر جس نے اپنے "بدماش" چھوٹے بھائی کی "ناسوک" اپنے گھر بسالی ہے۔ اور اس کا اپنا بڑا بھائی دیو کمار ------ آج ------ تھو ------"

" وہ شخص جس نے باغ میں جھاڑی کے پیچھے سے طنزیہ قہقہہ لگایا تھا۔ وہ

بھی یقیناً کوئی بڑا بھائی تھا ——— بڑا بھائی ——— اخ

——— تھو ———"

" یہ بڑے بھائی ——— نہیں ہر بڑی چیز بُری ہے۔ ہمیں کبھی
ان کے دوست نہیں بننا چاہیئے۔ جو بڑے بھائی ہیں۔ میں آج سے تمام ایسے
دوستوں سے تعلقات منقطع کر لونگا۔ بڑی تھالی۔ بڑی کتاب ———
بڑا کوٹ ——— بڑی گھڑی ——— ہر بڑی چیز ———
اخ ——— تھو ———"

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے آخری بار اس کونے میں تھوکا۔ لعاب کے کچھ
حصے اس کارڈ بورڈ پر بھی پڑے۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "تھوکنے والا
حوالۂ پولیس کیا جائیگا"

بازار میں نکلتے ہی سامنے وہی بی۔ اے پاس نکٹائی فروش دکھائی دیا
——— کمل کو اپنی پھٹی ہوئی نکٹائی کا احساس ہوا ——— "یقیناً اُسے
کُسم کی ملاقات سے زیادہ ایک نئی نکٹائی کی ضرورت ہے! اچھا ہوا۔ کہ کُسم نہ
ملی۔ اگر مل جاتی۔ تو اسکی پھٹی ہوئی نکٹائی .... نہیں وہ نئی نکٹائی ضرور
خریدے گا۔ لیکن کُسم کو دکھانے کے لئے نہیں۔ وہ ایسی بات سوچتا ہی کیوں
ہے۔ آخر وہ اسکے سامنے نئی نکٹائی پہنکر کیوں جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کی
کون ہے؟"

نکٹائی فروش نے نکٹائیوں والا ڈنڈا آگے بڑھا دیا۔ کمل نے ایک
پسند کی ——— " کتنے دام ———"

"بچھ آنے ———"

"کچھ کم کرو۔ دوست۔ لیکن یہ کیسی رہے گی ———؟" کمل نے بٹوا کھولتے ہوئے کہا۔ "اسکے کیا کہنے ——— بڑا عمدہ ڈیزائن ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"بڑا عمدہ ہے تو میں نہیں لوں گا ———" "کیوں۔ کیا بات ہے ———" آخر بڑے کے سوا تمہارے پاس اور کوئی لفظ نہیں تھا۔ نہایت عمدہ کہتے۔ بہت عمدہ کہتے۔ خوب عمدہ کہتے۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے تو چھوٹا عمدہ ہی کہتے ——— بڑا ——— بڑا ——— آخر بڑا عمدہ ہونا کیا ہے ———؟

نکٹائی فروش کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دام کی جگہ نکٹائی واپس آ گئی۔

(۲)

کمل لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ لاہور کی دلچسپیاں کمل کے دل سے کشمیر کی یاد کو دور نہ کر سکیں۔ حضوری باغ کی پچھلی طرف مہاراج گنج کے سرے پر اُس کا مکان۔ جس کی کھڑکیوں سے دور تک ڈل کا پانی دکھائی دیتا تھا۔ جس کے پرلے کنارے پر شنکر آچاریہ کی پہاڑی ایک عجب رعنائی سے کھڑی تھی۔ اور پھر اسکے کمرہ کے عین سامنے اُگا ہوا چنار۔ جس کی چند شاخیں کمرے کے اندر تک آ گئی تھیں۔ اور جس کی ایک شاخ پر ایک کوئل نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ اس کوئل کی آواز بہت رسیلی تھی۔ کسم کی طرح۔ اور پھر کسم بھی تو اُسے بہت یاد آتی تھی۔ لاہور کے میڈیکل کالج کی خوبصورت اور شوخ لڑکیاں

مال روڈ پر شام کے وقت ٹہلنے والی بلبلیں۔ تانگوں میں بیٹھی بیٹھی اچانک کسی کو دیکھکر مسکرا دینے والی تتلیاں۔ اور خصوصاً اسکی ہم جماعت صغرا جو اسکے کشمیری حسن پر بے حد فریفتہ تھی۔ یہ سب مل کر بھی اسکے دل سے کُسم کا خیال دور نہ کر سکیں۔ حالانکہ وہ خود کئی مرتبہ سوچتا۔ کہ "آخر کُسم میری کون ہے ——؟" اس کا جواب اسکے پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن اُسے اپنے دماغ سے نکال دینا اسے اپنی طاقت سے بعید نظر آتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چاہا کہ کسم کو خط لکھے۔ لیکن پھر وہ یہی سوچتا کہ "وہ اسکی کون ہے —— خط سے وہ کیا سمجھے گی ——" اور وہ پہلی لکھی ہوئی سطر پر خط کھینچ دیتا۔ کئی بار اُسے خیال آتا کہ "محبت یکطرفہ نہیں ہو سکتی۔ ضرور اُسے بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ اُنس ہے" لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے آپ پر ہنس دیتا "اگر کچھ اُنس ہوتا۔ تو یہ بہترین موقعہ تھا۔ اسکے اظہار کا —— اگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ تو وہی لکھتی ——"

اسی طرح کمل کو لاہور آئے ہوئے کچھ مدت گذر گئی۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں۔ اسی سال کالج کی جانب سے ایک پارٹی کیلاش پربت کی ایک چوٹی سر کرنے کی غرض سے بھیجی گئی۔ کمل اسی کے ساتھ چلا گیا —— وہاں ایک بار گر جانے کے باعث اس کی ٹانگ کو ضرب آگئی۔ اسکے ساتھیوں کا بیان تھا۔ کہ شدت درد سے جب وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ تو کئی مرتبہ اسکے منہ سے "کسم" کا نام نکلا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ کہ "کسم تمہاری کون ہے ——" وہ خجل ہو گیا۔ اور اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ کہ "وہ میری کون ہے۔ جسے میں خواہ

مخواہ بدنام کر رہا ہوں ——"

کمل کے دل کی یہی غیر یقینی حالت تھی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ مہم سے واپس آئے۔ ہوسٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اُسے فرش پر تین خط پڑے ہوئے ملے۔ ڈاکیہ اسکی غیر حاضری میں خط وہیں پھینک جاتا رہا۔

(پہلا خط کسُم کا تھا)

"آپ بھی اچھے ہیں۔ یہاں کوئی مہینوں آپکے خط کا انتظار کرتا کرتا مر جائے۔ لیکن آپ کو کیا۔ وہاں کی نئی نئی دوستوں سے کب فرصت ملتی ہوگی۔ کہ اُس غریب کی یاد بھی آجائے۔ جسے دور کہیں پہاڑیوں میں چھوڑ آئے۔ بہر حال مطلب کی بات سنئیے۔ میری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اور میں حتیٰ الامکان ٹال مٹول کر رہی ہوں۔ آپ کو چھٹیاں ملنے والی ہونگی۔ چنانچہ فوراً آجئیے مجھے آپ کا وہ سندیسہ بھولتا ہی نہیں جو آپ کی آنکھوں نے خاموش زبان میں جاتے وقت مجھے دیا۔ اسی لئے آپ پر پورا بھروسہ ہے ——"

کمل کو اب تاب کہاں۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ کسُم اسکی کون ہے۔ چنانچہ وہ فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ جس میں مہم پر جانے کے باعث جواب کی دیری کے لئے معذرت کی۔ اور اُسے یقین دلایا۔ کہ وہ اسی شام روانہ ہو رہا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو چکنے کے بعد اُس نے دوسرا خط کھولا۔ والد کا تھا۔ اُسے بڑے بھائی کی شادی پر بلایا تھا۔ اُن کا ایک ہی خط تھا۔ شائد اس خط کے بعد انہیں اس کے مہم پر جانے کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ اور انہوں نے خط بھیجنا

بے سود سمجھا ہو! تو کیا انہوں نے کمل کے پہنچے بغیر ہی دیو کمار کی شادی کر دی ہو گی۔ یقیناً کر دی ہو گی۔ آخر چھوٹے بھائی کے پہنچنے نہ پہنچنے کی وقعت ہی کیا ہے ــــــ؟"

(۴)

کمل تانگے سے اترا۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ ابھی اس کے گھر میں سے کسی نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ فوراً شور مچ جاتا خصوصاً ننھا تو ستی۔ اُسے معلوم ہو جائے۔ تو وہیں سے شور مچاتا ہوا بھاگے۔ اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے۔ سامنے ہی اُس کا کمرہ تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی اُگا ہوا وہ چنار جس کی ایک شاخ پہ کوئل نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ لیکن اب وہاں گھونسلا نہیں تھا۔ اُسے اپنے کمرہ میں بھی بتی جلتی دکھائی دی۔ شاید اسکے کمرہ پر کسی نے قبضہ جما لیا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا۔ دیو کمار باہر نکلا۔ کمل نے آگے بڑھ کر نمستے کی۔ دیو کمار پیچھے کی طرف دیکھ رہے تھے" کسے دیکھ رہے ہو بھیا ــــــ" "تمہاری بھابی آئی تھی۔ جانے کہاں لے گئی ــــــ"

اتنے میں اندر سے کسم آتی دکھائی دی۔ دیو کمار کہنے لگا" لو۔ تمہارا دیور بھی آخر آ پہنچا ــــــ اس نے سمجھا تھا۔ کہ شاید یہ نہ آئے گا۔ تو شادی ہی نہ ہو گی ــــــ"

کمل محض اتنا ہی کہہ پایا" مجھے افسوس ہے ــــــ" اور چلا گیا۔ ــــــ دیو کمار نے سمجھا کہ کمل نے مجھے جواب دیا ہے اور کسم

سمجھی۔ کہ یہ بات اُسے کہی گئی ہے ——— کمل کو گلی میں کلوا گوجر ملا۔ جو اپنی بہو کو ساتھ لیئے کہیں جا رہا تھا۔ غالباً اپنے بدماس چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر جو منڈی باغ کی نکڑ پر اسی بی۔ اے پاس نکٹائی فروش نے نکٹائیوں والا ڈنڈا اسکی جانب بڑھاتے ہوئے ایسی نظروں سے اسکی جانب دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ "تمہیں کسُم سے زیادہ ایک نئی نکٹائی کی ضرورت ہے ——— کمل بابو"

لاہور۔ جنوری ۱۹۴۲ء

دان

نوکری سے ہٹایا گیا نوکر سیٹھ باری لال کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑا رہا تھا۔
سیٹھ صاحب۔ آپ نے اتنے سالوں سے مجھے اُن کھلایا۔ سب کچھ کیا۔ اب میری تنخواہ
سے یہ جرمانہ وصول نہ کریں۔" سیٹھ صاحب ایک چکنے گھڑے کی طرح بھیگے بغیر نہایت
بے اعتنائی سے تازہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور نوکر آنکھوں میں آنسو روکے
ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مہاراج میری کل پونجی یہی ہے۔ ان ہی روپوں سے میں نے
اب اور جگہ نوکری نہ ملنے تک نہ جانے کتنے دن یا مہینے گزارنے ہوں گے۔ میری
آٹھ روپے تنخواہ میں سے سات روپیہ جرمانہ وصول کرنے سے مہاراج آپ کا
تو کچھ نہیں بنے گا۔ لیکن میرے کئی مہینے بھوک اور افلاس سے بھر جائیں گے۔
میرے لئے آنے والے دن رات کی طرح کالے ہو جائیں گے۔" لیکن سیٹھ صاحب
پر ان باتوں کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے نہایت منصفانہ طور پر کہا "تم
نے میری پچاس پیسے کی چیز کا نقصان کر دیا۔ اور میں نے تمہیں سات روپیہ جرمانہ

کر دیا۔ تو کیا آفت آ گئی" اس وقت رلدو رسوئیے کی آنکھوں میں بیٹھا ہوا پانی چل پڑا۔ اس نے کہا "حضور آپ کے پچاس روپوں اور میرے سات روپوں میں کیا مناسبت۔ میرے لئے ان سات روپوں کا مطلب کئی مہینوں کے فاقے ہیں .... اور نہ سہی۔ تو آپ سمجھ لیں۔ کہ ایک غریب کو دان ہی کر دیا تھا" "میں نے کبھی ایسا دان نہیں سمجھا" اس خشک جواب نے غریب کی تمام امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔

چند ماہ بعد سیٹھ صاحب کو کار کا ایک حادثہ پیش آیا۔ بہت شدید حادثہ تھا۔ سیٹھ جی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور دھا نے کون انہیں اٹھا کر ہسپتال میں چھوڑ گیا۔ اسکے بعد ہلچل پیدا ہو گئی۔ ہسپتال کے دروازوں پہ موٹروں کا ہجوم لگنے لگا۔ اور ڈاکٹروں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑنے لگی۔ آخر سیٹھ صاحب ٹھیک ہو کر گھر واپس آئے ...... چند دن کے بعد ڈاکٹر کا بل پہنچا۔ منیم نے بل کھولا۔ اور ہکا بکا سا رہ گیا۔ سیٹھ صاحب نے پوچھا "کیوں۔ کتنے کا بل ہے؟" منیم نے سُستی سی آواز میں بتایا "چار ہزار روپیہ کا"

"چلو پھر کیا ہُوا؟ سمجھ لیں گے کہ دان کیا تھا" منیم کو اپنے کانوں پہ اعتبار نہ آسکا

لاہور۔ فروری ۱۹۳۹ء

غلامی

بہت سال ہوئے۔ اس کے ماں باپ کو ایک شکاری پکڑ لایا تھا۔ اور تب سے وہ شہر سے باہر کی طرف بنے ہوئے اونچی اونچی سلاخوں والے چڑیا گھر میں ہی رہتے تھے۔ چند ماہ تو آزادی کا گھاؤ تازہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ آزادی کی تڑپ اسی پنجرے میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اور پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہیں قید کی ٹھنڈی سیخچوں سے ہی انس ہو گیا۔ اور اب تو ان سیخوں کے ساتھ بدن رگڑ رگڑ کر گرمی پیدا کرنا ہی ان کا کام تھا۔

"تماشہ دیکھنے کے لئے آنے والوں کی زبان سے" بے چارہ پنجرے کا شیر"

سُن سنکر انہیں راحت ملنے لگی۔ اور سچ پوچھو تو جس دن لوگ ان کی غلامی کا نظارہ دیکھنے نہ آتے ان کی طبیعت کو چین ہی نہ آتا۔ کہاں وہ پہلے دن کہ غلامی کی شرم کے مارے وہ منہ باہر نہیں نکالتے تھے۔ اور کہاں آج کہ انہیں "بے چارا پنجرے کا قیدی،، کہلانے میں راحت محسوس ہوتی۔ اور اگر کوئی چلتا پھرتا اپنے ساتھی سے یہ کہتا "اگر کہیں یہ جنگل میں ہوتا تو تم اور مجھ جیسے سینکڑوں کو اب تک کچا چبا گیا ہوتا" تو یہ سنکر ہی جیسے ان کی دلیری کا مقصد پورا ہو جاتا جنگل میں ایک نئے اور مشکل سے قابو آنے والے شکار کو مار کر جتنی راحت ان کو محسوس ہوا کرتی تھی۔ بالکل یہی حالت یہ باتیں سننے سے ان کی ہو جاتی۔

اسی جگہ وہ پیدا ہؤا تھا۔ اس نئے پیدا ہونے والے کو تو کوئی دکھ ہی نہ تھا۔ وہ تو غلامی کی پیدائش تھا۔ جب ماں باپ آزادی کو بھول چکے تھے۔ اسکے لئے تو غلامی کو ہی آزادی سمجھنا قدرتی تھا۔

جب اسکی معصومیت چنداں دور ہوئی اور وہ گوشت پر جھپٹنے کی مہارت کرنے لگ گیا تو ایک روز اس نے ماں سے پوچھا "ماں! یہ جو رات کو ہمارے مکان کے باہر آکر چیخا کرتے ہیں یہ کون ہیں؟" ماں نے کہا "بیٹا۔ وہ گیدڑ ہیں بہت ڈرپوک ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "ہم کون ہیں؟" جواب ملا "شیر" بیٹے نے پھر پوچھا "شیر اچھے ہوتے ہیں یا گیدڑ؟"

ماں نے کہا "بیٹا شیر سب سے اچھا ہوتا ہے۔ ہم ان سب کے راجہ ہیں" اور بیٹے کو پیار کر کے کہا "اور تم شہزادے!"

بیٹے نے شہزادگی کے رعب میں آنکھیں مٹکا کر جبڑا کھولکر اور لمبی لمبی اور سخت مونچھوں کو ہلاکر اپنے پورے ناخن باہر نکال لئے اور اس زور سے پنجہ مارا کہ سامنے پڑا ہوا گوشت اسکے ناخنوں میں پھنس گیا۔

اس رات جب گیدڑ آئے تو غلام شہزادہ نہایت رعب سے انکی طرف آیا اور تمکنت سے بولا "ابے شرم نہیں آتی۔ گیدڑ ہو کر ہمارے سامنے بولتے ہو"

ایک گیدڑ بچے نے جواب دیا "تم سے تو پھر بھی اچھے ہیں جو آزاد ہیں تمہیں تو غلام ہو کر بھی شرم نہیں آتی"

شہزادہ ماں کے پاس بھاگ آیا "ماں! غلام اور آزاد کیا ہوتا ہے؟"

ماں کے دل میں آزادی کا گھاؤ نہ جانے کب کا مل چکا تھا۔ لیکن آج بیٹے کی زبان سے کچھ ایسا چرکہ لگا کہ گھاؤ کے تمام بند ٹوٹ گئے۔ اور اسکا خون بے تحاشہ آنکھوں کے راستہ بہنے لگا۔ بیٹے نے جب ماں کو روتے دیکھا تو اسے بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے سمجھا میں کتنا کم عقل ہوں۔ نہ جانے کتنی بری چیز کا نام میں نے لیا ہے۔ جو ماں کو اتنی تکلیف ہوئی!

اس واقعہ کے بہت دنوں بعد ...... ایک دن ایک چھوٹے سے

گیدڑ کے بچے نے نہایت رازداری کے لہجے میں اس سے پوچھا "بھیا کیا تمہیں آزادی کا کبھی خیال نہیں آتا؟"

اتنا سنتے ہی شیر بچہ بلک بلک کر رو پڑا۔ اور اسے ہاتھ سے روک کر کہنے لگا "میرے سامنے اس چیز کا نام نہ لو مجھے یہ سنکر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آخر اتنی تکلیف دہ اور بری چیز کا نام میرے سامنے تم کیوں لیتے ہو؟"

لاہور۔ اپریل ۱۹۳۹ء

کنبھ کے بعد

کافی دیر تک ہاتھ میں درانتی پکڑے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ کھدر کے کپڑے۔ شام کے سورج کی ترچھی کرنیں اسکے منہ کو لال بنا رہی تھیں۔ اس نے اپنا سر ریلوے لائن کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ اور پتھر دل میں ہی سویا ہوا تھا بے خبر جیسے بہت ہی تھکا ماندہ ہو۔

کھیتوں میں آ جانے پر بھی وہ بار بار دیکھتی ہی رہی۔ نہ جانے کیوں شاید اس لئے کہ وہ اس کی آنکھوں کو خوبصورت نظر آیا۔ اور اس لئے بھی کہ وہ پردیسی تھا۔

اس کے چلے جانے کا خیال دل میں بار بار آ کر اُسے جی بھر کر دیکھنے کو مجبور کر رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک ریگستان کا پیاسا بیر جاتا ہوا۔ کہ پھر نہ

جانے کب اس کے درشن ہونگے۔ پانی کو جی بھر کر پینا چاہتا ہے۔

شام کے چھ بج گئے تھے۔ ہردوار سے آنے والی شام کی گاڑی صرف دو فرلانگ دور جوالا پور سٹیشن پر کھڑی تھی۔ انجن چلنے کی سیٹی بھی سنائی دی۔ وہ مسافر وہاں سے ہلا نہیں۔

گھاس چھیلتی چھیلتی کے ہاتھوں سے درانتی گر گئی۔ اسے آج پہلی بار محسوس ہوا۔ کہ ان کا کھیت ریلوے کی پٹڑی کے نزدیک ہوتا ہوا بھی اس سے بہت دور تھا۔

اس کے پاؤں میں دو چار کانٹے بھی جھاڑی میں سے چبھ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بھاگ رہی تھی۔ بے تحاشا ——— اتنے میں انجن نے ایک زبردست چیخ ماری۔ مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن........ انجن بالکل پاس آ گیا۔ اپنے پورے زور میں۔ وہ آدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن انجن کی ہیبت ناک شکل چند قدم پر ہی دیکھ کر اسے اپنا بچنا نا ممکن نظر آیا۔ سر چکرا گیا مگر اتنے میں کسی نے اسے زور سے باہر کی طرف کھینچ لیا ——— ابھی دونو کھڑے بھی نہیں ہونے پائے تھے۔ کہ انجن پاس سے انہیں ہوا کا ایک زبردست دھکا دے کر گذر گیا۔

نیچے ایک طرف کو ایک کھڈ تھی۔ جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے اپنے آپ کو اس کھڈ میں پایا۔ اور ———

جیسے چاند کو آگ لگ گئی ہو۔ اور کالے کالے بادل اسکے گرد جمع ہو گئے ہوں۔ ایسا ہی اسے محسوس ہوا۔ جب اس نے اپنے پاس ہی پڑی

ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کا ماتھا خون سے رنگا ہوا دیکھا! اسکے بال کھل کر اسکے منہ پر آ گئے تھے۔ اور وہ خود بیہوش ہو چکی تھی۔

وہ جلدی سے اٹھ کر اسکی طرف جانے لگا۔ تب اُسے یہ بھی پتہ لگا کہ اسکی ٹانگ نے کام کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ اور کہ اسکے بدن میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسکے بعد۔ . . . . جیسے یہ سب کچھ محسوس ہونا پھر سے بند ہو گیا۔ اور پھر دیکھنا بھی۔ سننا بھی۔ اب وہ پھر شدت درد سے بیہوش ہو گیا تھا۔

اس مسافر کو بہت دنوں تک ہوش نہیں آیا۔ ہوش آنے پر اسے یہ پتہ لگا۔ کہ وہ چماروں کے گھر میں ہے۔ ایک بوڑھا تھا۔ ایک بڑھیا اور وہ . . . لڑکی جسکو اس نے اپنے ساتھ کھڈ میں پڑے پایا تھا۔ اسکا نام تھا چمپا . . . . . چمپا کو جیسے اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سارا دن مسافر کا ہی کام کرتی رہتی۔ روز وثیدجی سے حقیقت بیان کرنے جاتا۔ دوائی لاتا۔ اور پھر اسے دوپہر کو باہر کھیتوں میں درختوں کے سائے میں لٹاتا۔ اور اسکی تیمارداری کرتے رہنا۔ جب بھی مسافر نے اپنی کمزور آنکھوں کو کھولا۔ چمپا کو اپنے منہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے پایا۔

مسافر دھیرے دھیرے کچھ کچھ چلنے کے قابل ہو گیا۔ اسے باہر نالے کے کنارے سیر کرانے کے لئے چمپا ہی لے جایا کرتی۔ مسافر کو تو فرحت سی محسوس ہوتی ہی۔ لیکن چمپا جب اسکا ہاتھ پکڑ کر چلتی۔ تو اسکے بدن میں

ایک بجلی سی دوڑ جاتی۔ وہ ہاتھ سے تو اسے بتاتی "دیکھو یہ کنیا گورو کل کا باغ ہے۔ وہ دور سامنے گاندھی آشرم ہے۔ وہ پرے گوروکل مہاودیالہ ہے۔ اسکے پرلی طرف گنگا کی نہر ہے اور اسکے پرلے کنارے پر رشی کل" لیکن اس کی آنکھیں در اصل ان سب سے پرے آکاش کے اننت نیلے رنگ کو دیکھا کرتیں —— پرے اپنے تصور کی دنیا کو...... مسافر یہ سب کچھ سنکر چپ رہتا۔ وہ سوچا کرتا۔ کہ اسکے پاس ہی ہردوار ہے جہاں کنبھ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ سے سیوا کرنے کیلئے والنٹیر آرہے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس میں رہ گیا ہوں۔

(۲)

ایک دن مسافر سو رہا تھا اور چمپا اس کے سرہانے بیٹھی تھی جب مسافر نے آنکھیں کھولیں۔ اور اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ ٹکٹکی لگائے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مسافر نے کہا "چمپا! —— "چمپا روندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی "کیوں! —— "مسافر نے کہا "رو کیوں رہی ہو" "کچھ نہیں" اور یہ کہہ کر وہ اسکے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ مسافر سمجھ گیا

اس نے کہا "پگلی کبھی مسافر سے بھی پریم کرتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر پریم کرنا چاہیئے" چمپا نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا "لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں" اور سسک سسک کر رونے لگی۔

اسی طرح اور چند دن بیت گئے۔ مسافر اور چمپا دونو کچھ مغموم سے

رہنے لگے۔ ایک دن وہ مسافر کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی ——— "تو کیا تم رک نہیں سکو گے مسافر؟" مسافر اسکی درد بھری آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہوا صرف دیکھتا ہی رہا۔ چمپا نے پھر پوچھا "تم میرے ساتھ پریم بھی نہیں کرتے ...... کیوں؟" مسافر نے جواب دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اور چمپا کہتی گئی ——— "کیا تم برہمن ہو۔ اور ہم چمار۔ اس لئے؟" اور پھر اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ برہمن دیوتا کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ہمت کر کے اس نے کہا "تمہارے پریم کو تمہاری ذات نیچا نہیں کر سکتی۔ بلکہ تمہارے پریم کی پوترتا نے تمہاری ذات کو اونچا کر دیا ہے چمپا! ...... رہا میرا جانا۔ سو چمپا۔ نشکام سیوا سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے اگر کانگرس کا ایک بھی والنٹیر ایک عورت کے باعث خدمت سے منہ پھیرے۔ تو اس کا بُرا اثر ملک کے کئی سرفروشوں پر پڑ سکتا ہے۔ میں نے کنبھ کے میلے پر سیوا کرنے کا جو پرن کیا ہے۔ اس سے مجھے نہ روکو۔"

"تو کیا تم مجھ سے پریم نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ یوں کہو کہ کرتا ہوں۔"

"تو پھر تم مجھے چھوڑتے کیوں ہو؟"

"کتنی انجان ہو تم۔ اچھا یہ بتاؤ۔ کہ تم میرے لئے کیا کر سکتی ہو؟"

"میں تمہارے لئے دنیا کو نچھاور کر سکتی ہوں۔"

"نہیں چمپا۔ تم میرے خیال سے بالکل الٹی بات کر رہی ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتی ہو۔ کہ دنیا کی بھلائی کے لئے تم مجھے نچھاور ...."

چمپا نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھکر فقرہ بھی ختم نہ کرنے دیا۔ اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا "ایسا نہیں کہا کرتے"

پھر مسافر نے اسے سمجھایا۔ کہ اسے جانا ہی ہوگا۔ تب اس نے رنجیدہ خاطر ہو کر کہا:۔

"تو پھر کب ملیں گے ...... مسافر"

"اگر بھگوان کی اچھیا ہوئی۔ تو کنبھ کے بعد"

اس کے منہ سے نکل گیا "کنبھ کے بعد" اور پھر ایک آہ سی نکل گئی۔ پھر اس نے کہا "کیا کنبھ کے بعد ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟"

"کیوں نہیں"

"کس طرح؟"

مسافر نے کہا "شادی کر کے"

"ہماری شادی کون کریگا"

"تم گھبراتی کیوں ہو چمپا۔ جب پریم کرنا سیکھی ہو۔ تو اسکی ریت بھی سیکھو۔ ہم خود ہی دیوی کے سامنے شادی کر لیں گے"

بالآخر وہ دن بھی آیا۔ جب مسافر جگجیت پور چھوڑ کر جانے لگا۔

مسافر نے ایک بار چمپا کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسکی آنکھوں میں بہت دیر تک اپنی آنکھیں ڈالے رکھیں۔ اور پھر چل دیا۔

دو ہی قدم کے بعد اُسے آواز آئی:۔

"مسافر" وہ پھر ٹھہر گیا۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز سے وہ بولی:۔

"اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔ دیوتا!"

"کشور چند .... کیا کچھ اور؟"

"اور ....؟ اور اب کنبھ کے بعد!"

اور دوسری صبح سے پہلے کئی سڑکیں۔ کئی مکان اور سب سے بڑھ کر گنگا کا دریا ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔

کنبھ میں اب صرف چار دن رہ گئے تھے۔ اسکے گاؤں میں بھی اب اسی کا چرچا ہوتا رہتا تھا۔ چمپا کے لئے یہ چار دن بیتنے بھی مشکل ہو رہے تھے۔

جب اسکے گاؤں میں سے آس پاس کے راجپوت زمینداروں کے رتھ کنبھ کو جاتے ہوئے گذرتے۔ تو وہ بھی راستے میں کھڑی رہتی۔

اسے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے اسکے دل سے ایک خاموش سندیسہ نکلتا ہو۔ کشور کے نام "میرے کشور کو کہنا۔ کنبھ کے بعد نہ بھولے!!"

پھر اسے کچھ راحت سی محسوس ہوتی۔ جیسے رتھ کے پہیے چیں چیں کی آواز میں اس سے کہہ رہے ہوں "تم گھبراؤ نہیں۔ ہم کشور کے دیس کو جا رہے ہیں۔ اسے ضرور کہیں گے!"

اور اسکے تھرکتے ہوئے ہونٹوں میں سے جیسے کئی بوسے ان رتھوں کے ساتھ ہو لیتے۔ کشور کے دیس کی طرف بھاگتے ہوئے۔ اور وہ کھڑی دیکھا کرتی کنبھ سے آنے والوں کی راہ۔

آخر ایک رات اس نے سنا۔ کنبھ بخیریت گذر گیا تھا اس پر مستی سی چھا گئی

ہوئی تھی۔ وہ اسکے آنے کا تصور باندھتی رہی۔ دوسرا دن اسی ادھیڑ بن میں گذر گیا۔ وہ رات اسکی کئی مہینوں میں ختم ہوئی۔ اور دوسرا دن اسکو تو جیسے گذرتے سال ہی لگ گیا ہو۔

شام کے وقت گاؤں کے مزدور آئے۔ تو یہ چوپال کے پاس ہی کھڑی تھی۔

کرموں نے چارپائی پر گرتے ہوئے وہاں بیٹھے بڈھے سے کہا "گوپال دادا۔ آج تو تباہی آگئی۔ بالکل تباہی۔ جیسے پرلے آگئی ہو" اس نے بڑی بے صبری سے پوچھا "کیا ہوا۔ کیا ہوا؟"

"آگ۔ چاچا۔ وہ بڑی بازار۔ وہ جس کی بابت میں نے تمہیں کہا تھا کہ سارے ہردوار میں اتنا مال نہیں۔ جتنا صرف اس گنگا پار پھونس کے بنے ہوئے بازار میں تھا۔ مینا بازار تھا۔ مینا بازار۔ رات کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اندر پوری۔ جس کا حال پنڈت جی سنایا کرتے ہیں۔ اس میں آگ لگ گئی! اف کیسی آگ تھی۔ چاچا سب سواہا ہو گیا۔ قسم کھانے کو کوئی دکان نہیں بچ سکی۔ سارا۔ بالکل سارا جل گیا"

"کوئی آدمی تو نہیں جلا"

"ہاں ایک آدمی بھی جل کر مجروح ہوا۔ وہ بیچارہ برہمن تھا ایک نوجوان برہمن"

چمپا کے سینہ میں جیسے غم کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی اٹھاتے ہی میں اسکے پاؤں اسی راستے پر جانے لگے۔ جو کنیا گوروکل کے پاس سے ہوتا کنکھل کی طرف سے ہردوار کو جاتا تھا۔ اب بھی کچھ آدمی اپنے اپنے گاؤں کو آ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اسجگہ تک بھی پہنچ گئی۔ جہاں سے بچھڑتے ہوئے مسافر

ملا: سنہ ۱۹۳۸ء کے کنبھ کا ایک المیہ واقعہ۔

نے اسے کہا تھا۔ کہ " میرا جو کچھ کنبھ روپی بگیہ سے بچ جائیگا۔ وہ تمہارا ہوگا" وہ کچھ دیر کے لئے کھڑی ہو گئی۔ دور سے چار پانچ آدمی اکٹھے آ رہے تھے وہ پھر نہ جانے سن جیاؤں میں محو ہو گئی۔ کسی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

" کیا جگجیت پور کا گاؤں کہیں پاس ہی ہے "

اس نے دیکھا۔ ان نوجوانوں نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے جواب دیا

" ہاں .... کیوں ؟"

" اس لاش کو وہاں پہنچانا ہے "

" یہ کون ہے .... ؟"

" رُوڑکی کی آگ میں سخت زخمی ہؤا ہے۔ ایک بار اسے تھوڑا سا ہوش آیا تھا۔ اور اسکے منہ سے نکلا تھا " مجھے مرنے کے بعد جگجیت پور بھیجدینا ضرور ..... چماروں کے گھر ایک چمپا ہے۔ اور ..... " اور پھر بیہوش ہو گیا تھا۔

اپنے آپ پر قابو رکھکر وہ بولی " چارپائی کو نیچے رکھ دو "

وہ اُسکے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور ان آدمیوں سے کہنے لگی " آپ لوگ جائیں۔ جہاں انہوں نے پہنچنا تھا پہنچ گئے ہیں "

ہردوار۔ اپریل ۱۹۳۸ء

زود پشیمان

شاعر اپنی دھن میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اسکے کمرہ میں رہنے والے
دوسرے دو ساتھیوں کے درمیان ایک معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ وہ جھگڑا
تھا۔ جو خیالات و آراء کی مخالفت سے نہیں بلکہ تطابق سے پیدا ہو جاتا
ہے۔ فیض نے کہا۔ کہ نہیں وہ اس قدر بدکار نہیں ہے جتنا کہ
اس کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے" آخیر اُنتی لال نے اپنی عینک اتار لی
اور اُسے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اپنی ایک سُرخ آنکھ کی سُرخی کو
زیادہ نمایاں کرتا ہوا بولا۔

"تمہیں ان باتوں کا علم ہی کیا ہے۔ گذشتہ سال بھی وہ انہی کوارٹروں میں
تھی اور مجھے تمام حالات اچھی طرح معلوم ہیں۔ کوئی ایک دو دن تو کچھ بات کیے

لیکن جتنے مردوں سے اسکا تعلق ہے انکی گنتی کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے
اما۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر تم اس خوبصورت لڑکی کی اس قدر حمایت کیوں کرتے
ہو۔ کہیں تم بھی اسکے ——— ""
لڑکی کے لفظ نے شاعر کی فوری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ خوبصورت لڑکی کے
لفظ پر شاعر کا توجہ نہ دینا گویا شاعری کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگانا ہے۔ اسلئے وہ
بھی فوراً انکی بحث میں شامل ہو گیا۔
اس بات چیت کے دوران میں کئی ڈاکٹروں کئی سرکاری افسروں اور
کالجوں کے لڑکوں کے نام بار بار لئے گئے۔ ان سب کے متعلق ایک ہی شک کیا جاتا
تھا کہ انکا تعلق اس خوبصورت لڑکی" اصغری" سے ہے۔ شاعر بحث میں شامل تو تھا
لیکن دل سے نہیں بلکہ اسکی شمولیت اپنے دونوں ساتھیوں کی محققانہ باتیں
سننے تک ہی محدود تھی۔
خیراتی لال نے بحث ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کہ "اچھا ہاتھ
کنگن کو آرسی کیا۔ اب پھر وہ یہاں آگئی ہے۔ چند ہی روز میں دیکھ لینا کہ کسطرح
گل کھیلتی ہے" ——— لیکن شاعر نے اس کی یہ بات نہیں سنی۔ اس کی
آنکھیں سامنے والے کوارٹر میں کسی چیز پر اٹک گئی تھیں۔ اس کوارٹر سے
ملحقہ برآمدہ میں کوئی خوش جمال لڑکی اپنے چھریرے بدن کو نہایت دلکش انداز
سے ہلاتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔ ان دونوں کوارٹروں کے درمیان زمین نشیب
میں جاتی ہوئی ایک چھوٹی سی گھاٹی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ جس میں
چیل کے درختوں کی بہتات تھی۔ وہ لڑکی خود پر کسی کی مرکوز نگاہوں سے بے خبر

چہل قدمی کرتی ہوئی کبھی کسی درخت کی آڑ میں ہو جاتی اور کبھی پھر دو درختوں کے درمیان سے جلوہ ریز ہوتی۔ لیکن شاعر کی آنکھوں میں اسکے پہلے ہی جلوہ نے کچھ ایسی چکا چوند پیدا کر دی تھی کہ اُسے یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کب اور کہاں کوئی درخت اسکے جلوہ کو آڑ دے دیتا تھا۔ بلکہ اس کی آنکھوں سے تو جیسے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ سامنے کے برآمدہ کی تمام لمبائی پر ایک حسین سنہری خط کھینچ دیا گیا ہے جو بیک وقت اس کونہ سے لے کر اس کونہ تک سارے کا سارا جگمگا رہا ہے۔

دونوں دوستوں نے بحث ختم کر کے شاعر کی جانب دیکھا کہ شاید وہ کوئی فیصلہ کن بات کہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک دیکھ کر دونوں چونک پڑے۔ انہیں اس چمک کا راز اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ جو اسی وقت پیدا ہوا کرتی تھی جب شاعر پر کوئی غیر معمولی جذبہ طاری ہوتا تھا۔ اپنی ایک سُرخ آنکھ کو اس جانب گاڑتے ہوئے تیرا تھی لال نے پوچھا — "کیا ہے؟"

شاعر نے آنکھیں جھپکے بغیر سر ہلا کر اشارہ کیا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا تیرا تھی لال نے خود ہی اس کی جانب سے سوال پوچھا "وہ لڑکی؟" لیکن خود جواب دے سکا فیض احمد اچانک چیخ اٹھا "وہی تو ہے۔ وہی تو ہے" شاعر کے لب عجیب انداز سے ہلے "اصغری —" فیض احمد نے فوراً کہا۔ ہاں ہاں — وہی — نرگیا اسے اسی کوارٹر میں جگہ دی گئی ہے؟" اس کے بعد فیض نے اور نہ جانے کیا کچھ کہا لیکن شاعر نے کچھ نہیں

سُنا۔ اس خبر نے اسکی حیرانگی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ حسن کا مجسمہ بھی اپنے ماتھے کو داغدار بنا سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی شاعرانہ روح کانپ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ کیا بلور کی مانند شفاف پانی کے کیف زا چشمہ کی تہ میں بھی کیچڑ ہو سکتا ہے——؟ نہیں—— نہیں۔ اس کے دل سے ایک آواز آئی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس پانی کا بلوریں رنگ ان موتیوں کی آب کا مرہون ہے جو اس کی تہ میں ڈول رہے ہیں۔ نہیں۔ وہاں کیچڑ نہیں ہو سکتا——" شاعر کو قدرے تسکین ہو گئی۔ گویا وہ کوئی ایسی آواز سننے کا اسیطرح خواہاں تھا جیسے کوئی باپ اپنے بچے کو اپنی آنکھوں سے قبر میں دفنایا جاتا دیکھکر بھی اپنے سینے میں یہ خواہش موجود پاتا ہے کہ کوئی مجھے آکر کہے کہ تمہارا بچہ بہت شیطان ہو گیا ہے! ابھی ابھی دیکھو اس نے میرے لڑکے کو پیٹا ہے" اور اسے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ۔ موت۔ کفن دفن—— یہ سب کچھ ایک لمحاتی خواب تھا اور کہ اس کا بچہ ابھی شرارتیں کرنے کیلئے موجود ہے۔ اسیطرح شاعر نے یہ آواز سنی تو اسے ایک گونہ تسلی ہو گئی کیونکہ وہ اپنے تئیں روائتی طور پر حسن کا کچھ ایسا قریبی تعلقدار سمجھتا تھا اور حسن کی ایک ایسی ملکوتی تصویر اسکے دل پر نقش تھی کہ حسن کی بد اخلاقی اسکے لئے اپنے بیٹے کی موت ایسی ہی دکھدائی تھی۔

لیکن شاعر اس مجسمہ حسن کے متعلق اپنی خوش فہمی کا کانچ محل زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا۔ خیراتی لال کی جانب سے عائد کردہ الزامات کی سنگینی نے اسے دم بھر میں پاش پاش کر دیا۔ آخر کار شاعر محض یہی کہہ سکا کہ اسی کا

نام شاید دنیا کی تلخ حقیقت ہے۔ جسکی دیواروں سے اونچے آدرش اور معیاری خیالات سر ٹپک ٹپک کر رہ جاتے ہیں۔"

شاعر نے اپنے دل سے اس لڑکی کا خیال تک نکال دینے کی کوشش کی۔ لیکن سوء اتفاق۔ کہ وہ اس کوارٹر میں رکھی گئی جہاں وہ چوبیسوں گھنٹے اسکی آنکھوں کے سامنے رہتی جس کا قدرتی انجام یہ ہوا کہ اس نے اصغری کا خیال اپنے دل سے نکالنے کی جس قدر سعی کی اسیقدر اسکے دل میں ایک کشمکش زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ ایک دن اس نے طے کر لیا کہ وہ اس لڑکی سے ربط و ضبط پیدا کریگا اور وہ بھی محض اسلئے تاکہ وہ اسکی بداخلاقی کی علّت غائی معلوم کر سکے۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے دل میں یہ خواہش بھی موجود پائی کہ اگر ہو سکے تو اُسے سیدھی راہ پر لے آئے۔

یہ تھا وہ پاک و ملکوتی مشن جسے لیکر شاعر نے اصغری سے راہ و رسم پیدا کی۔ اس راہ و رسم کا آغاز کسطرح ہوا؟ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ کیونکہ اعلےٰ تعلیم پائے ہوؤں کے درمیان راہ و رسم کی ابتدا کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ بہرحال آپس میں کتابوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ شاعر نے اپنا کچھ مطبوعہ کلام بھیجا۔ کچھ افسانے بھیجے جن کی اصغری نے بہت تعریف کی۔

رفتہ رفتہ شاعر یہ محسوس کرنے لگا کہ اب جب وہ اصغری سے ملتا ہے تو اصغری کے چہرے پر وہ ضبط اور سنجیدگی کے آثار نہیں رہتے بلکہ اسکے چہرے پر کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا جس نے سنجیدگی کی جگہ اُسے متبسّم بنا دیا تھا۔ گویا کسی ماہر مصوّر نے اپنے پھرتیلے قلم سے اس تصویر میں چند ایسے آڑے ٹیڑھے خطوط کا

اضافہ کر دیا تھا جنہوں نے اس تصویر کے خدوخال میں جذبات کی گہرائی بھر دی تھی۔ اسکی آنکھوں میں اس نادیدہ مصوّر نے دو ایسے منوّر نقطے جڑ دیئے تھے۔ جنہوں نے ساری کی ساری تصویر پہ ایک نورافشاں ضیاء بکھیر دی تھی اسکی باتوں میں وہ پہلی سی ہچکچاہٹ اور اسکی نظروں پر وہ پہلا سا حجاب کا پردہ نہ رہ گیا تھا۔ وہ کئی بار اپنی نوکیلی پلکوں کو پوری طاقت سے اٹھا کر شاعر کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیتی۔

ان دنوں شاعر نے کئی بار آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ لیکن اُسے وہاں کوئی خاص جاذبیت یا حسن دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر وہ سوچتا کہ وہ یہاں کیا دیکھا کرتی ہے میری آنکھوں میں کیا دھرا ہے؟ جن میں وہ اسطرح اپنی نظریں گاڑ دیتی ہے گویا وہ تیکھی نظریں میری آنکھوں کی سطح کرید کرید کر اُنکی تہ میں کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ پھر اُسے خیال آیا "شاید وہ میرے اشعار میں پائے جانے والے جذبات کا حقیقی مسکن ڈھونڈتی ہے۔ تو گویا وہ میرے جذبات کی قدر کرتی ہے" اپنی خاموش مدح کا یہ خیال اس میں کچھ ایسا سرور پیدا کر دیتا کہ اُسے آئینہ میں اپنا چہرہ اتنا حسین و جاذب دکھائی دینے لگتا۔ کہ وہ کئی بار اُسے چوم لینے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت بہت دیر تک نہ رہتی۔ دوسرے ہی لمحہ میں جب اُسے اپنے حسین مداح کی سیاہ کاریوں کا خیال آتا۔ تو گویا آئینہ میں اسکے چہرہ پہ کوئی سیاہی پوت دیتا۔

رفتہ رفتہ کتابوں میں چھوٹی چھوٹی تحریریں آنے جانے لگیں جنکی کا صغریٰ کے ایک خط نے شاعر کو حیرت میں ڈالدیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"آپ کی تمام چٹھیاں ملیں۔ شکریہ۔ آپ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کریں گے کہ میں آپ سے یا کسی اور سے غیر ضروری قرابت نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اس طرح میری عزت پر دھبّہ لگتا ہے۔ آپ یہاں کے لوگوں کی ذہنیت شاید نہیں جانتے کہ وہ کس طرح رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں اور انکی عیب جو آنکھیں دوستیوں کے درمیان کسی بھی تعلق کو بُرے پہلو کے سوا کسی دوسرے پہلو سے نہیں دیکھ سکتیں۔ —— اس لئے جو بھی قدم اٹھائیں سوچ سمجھکر اٹھائیں۔ اگر آپ کسی جذبہ کی رو میں بہ رہے ہیں تو اسکے بہاؤ پر اسی جگہ اور ابھی بند باندھ دینا بہتر ہوگا ...."

یہ خط پڑھکر جیسے شاعر کے سر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اصغری کے خط سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شاعر کا مطلب سمجھنے لگ گئی ہے۔ اور یہی اس کے لئے نہایت حوصلہ افزا تھا۔ کیونکہ جو بات صاف کہنے یا لکھنے سے وہ ہچکچا رہا تھا۔ وہ اس نے بن کہے ہی سمجھ لی تھی۔ اب اس کی کسی بھی تحریر کے غلط معنی لئے جانے کا احتمال نہ رہا تھا۔ اور پھر اصغری نے بھی تو اپنے خط میں کسی مزید اقدام کی گنجائش چھوڑ دی تھی۔ گو شرط سوچ سمجھ کر ایسا کرنے کی تھی لیکن شاعر کو اس تحریر میں کچھ کرنے کی دعوت پنہاں دکھائی دی اس نے قلم اٹھایا اور آخر اُسے وہ بات لکھ ہی دی جسے وہ ابھی تک نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے لکھا ——

"نوازش نامہ ملا۔ شکریہ .... زیادہ جھمیلوں میں نہ پڑ کر سیدھی سادی بات سنئے۔ میں ایک سادہ لوح، انجان سا۔ پاگل سا شاعر

ہوں۔ جو قدرت کے حسن کو کسی بھی جگہ کسی بھی رنگ میں دیکھ کر مچل اٹھتا ہے جسکی سرشت میں۔ جس کے خمیر میں۔ جس کی مٹی میں قدرت کے بت ساز نے حسن پرستی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھئے۔ یہ حسن پرستی ہے ہوس پرستی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر محض یہ چاہتا ہے کہ شاعر اور حسن کا گہرا تعلق آج سے ہی نہیں۔ چند صدیوں سے نہیں۔ بلکہ اس روز سے موجود ہے جسے روزِ ازل کہتے ہیں۔

یہ ایک مسئلہ ہے کہ شاعر آخر حسن سے کیا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی چاہ لامحدود ہے۔ جس کے کسی بھی چھور کا صحیح تعین ناممکن ہے البتہ کمزور سے لفظوں میں اس کا مفہوم یوں ادا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اور حسن کے درمیان حجاب کا ایک ہلکا سا پردہ بھی نہیں رہنے دینا چاہتا۔ وہ تمام ظاہری تکلف داریاں اٹھا کر اس بے حجاب حسن کی نیرنگیوں میں اپنے تئیں کھو دینا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان جذبات کی پاکیزگی سمجھ سکتی ہوں گی اگر نہیں تو ایک مثال سنئے شاعر ایک حسین سی آبشار دیکھتا ہے۔ جس کے ہر عضو اور ہر رنگ سے حسن پھوٹا پڑتا ہے۔ اُسے حسن دکھائی دیتا ہے وہی جو روزِ ازل سے اس کا ساتھی ہے۔ وہ بے اختیار اس کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ آبشار اسیطرح اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی تمام رعنائی کو عریاں رکھے ہوئے ناچتی رہے۔ حجاب کی رتی بھر آمیزش اس کا دل کھٹا کر دیتی ہے۔ وہ اس آبشار سے کھیلنا چاہتا ہے اس کے پانی کو چھونا چاہتا ہے اور بعض حالتوں میں خود اسمیں گم ہو جانا چاہتا

ہے۔ اور کبھی کبھی دور کنارے ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ غرضیکہ وہ
پاگل ہو جانا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے اس پاگل پن
سے ہوش میں لانے کی کوئی دوا نہ کی جائے۔ شاید آپ اس کمزور عبارت
سے اس جذبہ کی ایک جھانکی دیکھ سکیں۔ ابھی میں بہت کچھ کہنا
چاہتا ہوں۔ لیکن رکنا ہی پڑتا ہے۔ میرا یہ شعر میری ہی حالت کی
ترجمانی کرتا ہے۔ ؎

یہ شب مختصر سی حکایت ہے لمبی
میں باتیں ہی باتیں کیا چاہتا ہوں

شاعر نے خط ختم کر کے ایک بار پڑھا۔ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ حیرت
زدہ خط کو دیکھتا رہ گیا آج اس کے قلم نے سہواً ہی یا صحیح الفاظ میں
نادانستہ طور پر ایک ایسا مسئلہ حل کر دیا تھا جس کا حل وہ خود ایک مدت
سے ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ مسئلہ تھا
"شاعر اور حسن کا تعلق" ایک مدت سے وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کیوں؟ ایسا
کیوں ہوتا ہے۔ کہ جب بھی کوئی حسین اس کی نظارہ جُو آنکھوں کے سامنے
آتا ہے۔ تو وہ اُس کی جانب ایک غیر مرئی کشش محسوس کرتا ہے۔ اس
سے ملنا چاہتا ہے۔ اس سے کسی نہ کسی طور تعلق کرنا چاہتا ہے۔ یا کم از
کم اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔ ابھی وہ اس تذبذب میں تھا۔ کہ اُس کھنچاؤ کی
بے بسی کو کیا نام دے "گناہ" کیونکہ اُسے دنیاوی مذاہب کے دنیاوی
ٹھیکیداروں نے یہی بتایا تھا۔ کہ ایک عورت کے بعد جسے تم اپنی ملکیت

بنا لیتے ہو۔ کسی بھی دوسری عورت سے کسی بھی طرح کا تعلق گناہ ہے لیکن اس کی شاعرانہ روح حسن و شاعر کے اس پاک علاقہ کو گناہ کہنے سے باغی تھی۔ علاوہ ازیں وہ اس تعلق کے کسی واضح نام کا تعین بھی نہ کر سکا تھا ——— محبت ——— نہیں محبت نہیں۔ یہ محض دیکھنے کی خواہش۔ صرف ہنس بولنے کی تمنا یا مل بیٹھنے کی آشا۔ یہ سطحی باتیں ہیں۔ یہ محبت کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ محبت کی گہرائی ناپ چکا تھا اُسے پتہ تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ کسی سے محبت کر چکا تھا۔ اور کہتا تھا ان کی محبت میں ابھی تک وہی گرمی تھی۔ جو کسی نوجوان کے سینہ میں کسی دوشیزہ کی چھاتی سے پہلی بار مس کرنے پر پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ امر اس متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق اس کی پریشانی کو زیادہ کرب انگیز بنا دیتا تھا وہ سوچتا "تو کیا میں گناہ کر رہا ہوں؟" لیکن اس کی روح یہ ماننے سے انکار کر دیتی۔ کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ کسی بھی حسین کو دیکھ کر وہ اپنے محبوب کو بھول نہ جاتا تھا۔ بلکہ جس قدر خواہش اُسے اس حسین سے بات چیت کرنے کے لئے پیدا ہوتی۔ اس سے کہیں بڑھ کر اُسے کوئی حسین دیکھتے ہی اپنے محبوب کی یاد تڑپا دیتی۔

چنانچہ شاعر کا دماغ دنیاوی اخلاقیات کی بے معنی و متضاد بیک دیگر تفسیروں کی الجھن میں پھنس کر جس مسئلہ کو حل نہ کر پاتا تھا۔ اُسے اپنے آپ کسی حد تک حل ہوتا دیکھ کر شاعر کے نحیف و خشک ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کا آڑا ترچھا خط کھنچ گیا

شاعر کے خط کا جواب آیا۔ اصغری نے لکھا تھا۔

"......یقیناً میں آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ میں کوئی مبسوط جواب دینے سے گریز کر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ مبادا! زیادہ گہرے پانی میں اتر جاؤں اور اندھا دُھند بہہ کر بیٹھوں۔ خدا را مجھے میرے تئیں چھوڑ دو۔ اور میرے دل کی شانتی کو پُر جوش ترنگوں کے ہاتھ میں نہ جانے دیجئے۔ گو مجھے اپنے دل پر قابو ہونے کا بھروسہ ہے۔ پھر بھی میں ڈر رہی ہوں۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے دل کا توازن کھو کر اپنے عمل کا توازن بھی کھو بیٹھوں۔ اس لئے مجھے یہی بہتر لگتا ہے۔ کہ ہم اپنے سطحی تعلق کو بھی توڑ دیں۔ جو غیر مرئی طور پر گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس خط کا جواب نہ دیجئے گا.........

اصغری نے لکھنے کو تو یہ لکھ دیا۔ کہ جواب نہ دینا۔ لیکن اسکے دل میں جواب کا انتظار موجود تھا۔ خط بھیجنے سے پہلے اس نے کئی بار اس فقرے کو کاٹ دینے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار غیر یقینی مستقبل کے متعلق کوئی ڈراؤنا احساس اسکا ہاتھ تھام لیتا۔ اور آخر کار اس نے اپنے نادان دل کی آواز دبا کر یہ خط اسی حالت میں بھیجدیا۔ لیکن اسکے بعد بھی اسکے دل نے یہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ شاعر کوئی جواب نہ دیگا۔ شاعر کو تو اس نے قطع تعلقی کے لئے لکھدیا لیکن اپنی نگاہوں کو بار بار شاعر کے کمرے میں جانے سے نہ روک سکی اور آخر کار اُسکے دل ہی کی مراد پوری ہوئی۔

خط پڑھنے کے بعد شاعر کے چہرے پر وہ فاتحانہ کھلاوٹ پیدا ہو گئی۔ جو تبسم سے گذر کر ہنسی کی حد سے کچھ اس طرف ہی رہ جاتی ہے۔ اور جو ایک فاتح کے چہرے پر اس وقت نظر آتی ہے۔ جب وہ دشمن کے عاجزانہ رویہ سے یہ اندازہ لگا لیتا ہے۔ کہ اس میں اب خم ٹھونک کر کھڑا رہنے کی تاب نہیں رہ گئی۔ اس نے سمجھ لیا۔ کہ تار دل میں پورا پورا تناؤ آ چکا ہے اب محض مضراب سے چھیڑنے کی دیر ہے۔ اور رایک و لنواز نغمہ گونج اٹھے گا۔ گھنٹوں اس پر ایک نشہ طاری رہا۔ جو شاید کبھی اترتا ہی نہ۔ اگر اسے یہ خیال نہ آتا۔ کہ "یہ سب جھوٹ ہے۔ اس میں پاکیزگی نہیں ہے۔ یہ ایک کھیل ہے۔ جو میں اس سے کھیل رہا ہوں۔ اور یقیناً اپنی دانست میں وہ سیاہ کار عورت بھی مجھ سے کھیل رہی ہو گی .... یہ جذبات اس کے صحیح جذبات نہیں ہو سکتے۔ یہ سب کچھ بناوٹی ہے .... بناوٹی .... مکر .... فریب ...."

اور وہ جوئے میں کوئی بڑا داؤ جیتنے والے بدمعاش کی طرح قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

بہرحال اس نے جواب لکھا جس میں اس نے اپنی طاقت بھر ریاکاری سے کام لیا۔ یعنی جو کچھ وہ صحیح طور پر محسوس کرتا تھا۔ اس کا بالکل الٹ لکھا۔ اور ان سب باتوں کا انجام وہی نکلا۔ جس کی توقع تھی۔ یعنی دونوں کے تعلقات اس قدر گہرے ہو گئے۔ کہ رات کے سناٹے میں لمبی ملاقاتوں تک نوبت پہنچ گئی۔ گو ان ملاقاتوں میں پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا

گیا۔ دجسے چھوڑنے کی خواہش شاعر کے دل میں تھی بھی نہیں) لیکن اس دوران میں شاعر نے کئی باتیں ایسی دیکھیں کہ اگر اس کے دل میں یہ چور نہ ہوتا۔ کہ اصغری مجھ سے پاکیزگی کا فریب کھیل رہی ہے۔ تو اُسے یقین ہو جاتا۔ کہ اصغری اس سے "عشق" کرتی ہے۔

بہرحال اس کے جذبات سے بے نیاز شاعر نے اپنا طرزِ عمل طے کیا۔ اُس نے اصغری کے سامنے کوئی حیوانی خواہش پیش کرنے کی ٹھانی جسکے متعلق اُسے یقین تھا۔ کہ فوراً منظور کر لی جائے گی۔ اور اسکے بعد . . . . . . اس نے سوچ رکھا تھا۔ کہ اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دے گا۔ اور کہ عین اس وقت جس وقت بڑے بڑے عابد و پرہیزگار اپنے آپ پر قابو رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی جانب سے آنکھیں بند کر کے چلا آئیگا۔ اور اس طرح اصغری کو دکھائیگا۔ کہ" دیکھ۔ انسان پر اس طرح اپنے نفس کا فاتح ہونا واجب ہے"۔ اور اُسے یقین تھا۔ کہ اس واقعہ سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

لیکن شاعر کے یہ سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ کسی بھی طرح اصغری کو گناہ کی جانب مائل نہ کر سکا۔ اصغری کے اس انکار کا انجام بھی حیران کن تھا۔ اصغری کی جانب سے جُوں جُوں انکار بڑھتا گیا۔ شاعر کی خواہش ہارتے چلے جانے والے قمار باز کی طرح تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اصغری اگر اقرار کر لیتی۔ تو شاعر کی گراوٹ مشکوک ہونے کا امکان بہت تھا۔ لیکن اسکے مسلسل انکار نے شاعر کی گراوٹ یقینی کر دی۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

اس "پاکباز" شاعر کا مقصد حیات ہی اس لڑکی کو گناہ کے گڑھے میں دھکیلنا رہ گیا تھا۔

انجام کار شاعر ایک روز ایسا بھڑکا۔ کہ اُس نے جوش میں آ کر اُسے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ "فلاں ڈاکٹر۔ فلاں میڈیکل افسر۔ فلاں انسپکٹر پولیس اور فلاں فلاں طالب علم کے سامنے جس بات سے تمہیں باک نہ تھا اس سے اب کیوں ہے؟"

اصغری کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ وہ غلیل کھائی ہوئی چڑیا کی مانند لوٹ گئی۔ اس کی نیم وا رہنے والی سرمگیں آنکھیں اپنی پوری وسعت میں کھل گئیں۔ جواب دینے کے لئے اسکے لب پھڑکے۔ لیکن کھلے کے کھلے رہ گئے چند لمحے تو وہ اسی حالت میں رہی۔ بعد ازاں کچھ سوچکر اپنے ٹرنک کے قریب گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھولا اور ٹٹول کر ململی کپڑے کا ایک بقچہ نکال لائی۔ اور اُسے شاعر کے سامنے ٹپک دیا۔ اس کے تھرتھراتے ہونٹوں سے محض اتنا نکلا۔ کہ "خدا را اسوقت چلے جائیے۔ یہ بقچہ لیتے جائیے اور اس میں جو کچھ ہے۔ پڑھکر مجھے لوٹا دیجئے گا"۔ اتنا کہہ کر وہ قریب بچھی ہوئی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ گویا اُس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ اور سرہانے میں اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔ شاعر نے سسکیوں کی آواز سُنی۔ لیکن وہ اسکے قریب نہ جا سکا۔ اس نے دوبارہ بقچہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن نسوانی سسکیوں کی آواز نے اسکے اعصاب پر ایسا اثر کیا کہ انگلیوں کے ارتعاش کے باعث وہ بقچہ نہ اٹھا سکا لیکن وہ ان سسکیوں

کی آواز بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جنگو بند کرانے کے لئے وہ اصغری کے قریب تک نہ جا سکتا تھا آخر اس نے اپنے تمام جسم کی طاقت انگلیوں میں مجتمع کر کے اس انجیر کو اٹھا ہی لیا۔ اور خاموشی سے چلا گیا۔

شاعر جوں جوں چٹھیاں پڑھتا جاتا تھا۔ اس کی پیشانی سے شرمندگی کے قطرے ٹپکتے جاتے تھے۔ یہ سب انہی لوگوں کے خطوط تھے۔ جن کے متعلق اصغری سے کئی کئی رومانی حکائتیں والبستہ تھیں۔ اور ہر ایک خط میں وہی ایک بات تھی محبت .... محبت .... اور محبت ہر ایک نے اُسے اپنے دل کی رانی بنایا تھا۔ ہر ایک نے اُسے اپنا مقصد حیات بیان کیا تھا جس کے حصول کے بغیر ہر ایک کی زندگی بیکار تھی۔ بعض ایک نے انکار کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ کئی ایک نے اپنی جاں بلب حالت کا دردناک منظر کھینچا ہوا تھا۔ (گو ان میں سے ایک کو بھی آج تک اپنی عیش ترک کر کے بیمار ہونے کی فرصت نہ ملی تھی) شاعر نے اپنے سامنے مردوں کے مکروفریب کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا ساگر دیکھا۔ جس کی اٹھتی ہوئی لہروں کی چمک اس کے پانی کی ڈراؤنی سیاہ صورت پر پردہ کئے ہوئے تھی۔ جس کے کنارے اُگے ہوئے پھولوں کی باس نے اس کی عفونیت کو ایک ہلکے سے آنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان تمام خطوط سے ایک اور بات بھی مترشح تھی۔ اور وہ یہ کہ اصغری نے کسی ایک کی جانب بھی اب تک محبت بھری نگاہ تک نہ اٹھائی تھی۔ ہر ایک عاشقِ زار نے اپنے مسلسل خطوط میں اسی کا گلہ کیا تھا۔ اس سے قبل کہ شاعر

اِن خطوط کی ولدل پار کر جانا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اصغری کا ایک حسین مرمریں مجسمہ کھڑا ہو گیا جس کے بشرہ سے معصومیت اور پاکیزگی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کا ایک دھندلا سا نقش تھا جس میں ان مردوں کی ریاکاری کے لئے طنز پنہاں تھا اس دیوی کی مورتی کے سامنے تصور ہی تصور میں شاعر کا سر جھک گیا۔

شاعر نے ایک ایسی آواز میں جس میں خجالت کی کپکپاہٹ کو کوشش سے دبا یا گیا تھا۔ پلکوں سے آنکھوں پر پردہ کرتے ہوئے کہا "میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ صرف ایک بات ——— پوچھنا باقی ہے ———" وہ ساعت بھر کے لئے رک گیا۔ گویا از خود بکھرتے جانے والے الفاظ کی کڑیاں جوڑ رہا ہو .... "صرف یہ بات۔ جسے میں ہزار کوشش کرنے پر بھی نہیں سمجھ سکا۔ کہ ...." اس کی زبان بوجھ سے لدے ہوئے مزدور کی ہر لحظہ تیز تر ہوتی جانے والی رفتار کی طرح تیزی سے چل رہی تھی۔ گویا وہ ایک بوجھ جلد از جلد اٹھا پھینکنے کی سعی کر رہا تھا" .... مجھے تم نے وہ سب خطوط کیوں دکھائے۔ مجھ پر تمہیں اسقدر اعتماد کیسے ہو گیا۔ کہ ایک ایسا پوشیدہ راز میرے سامنے کھولتے ہوئے تمہیں رتی بھر پاک نہیں ہوا"

اصغری نے شاعر کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر اس کے قدموں پر ڈال دیں۔ شاعر نے اس کے چہرے پر نور اور سرخی کا ایک ایسا اجتماع دیکھا

گویا کوئی شفقتیں کرن اسکے چہرے پر ٹوٹ گئی ہو۔ اس کا بال بال کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے اس کے منہ پر کسی نے تالا جڑ دیا ہو۔ اور الفاظ وجذبات اسکے منہ میں ایک بند کمرے میں ڈال دیئے گئے شوخ بچوں کی طرح مچل رہے تھے۔ آخر کار اس نے ہمت کر کے کہا۔

"لیکن تم سے مجھے.........." فقرہ ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے گھٹنوں پر آرہی تھی۔ اور بھیگی ہوئی آنکھوں اور تمتماتے ہوئے گالوں کے مشترکہ مس نے شاعر کے پیروں میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو بجلی کی سی تیزی سے اس کی چوٹی تک پہنچ گئی۔ اصغری کا فقرہ پورا ہو چکا تھا۔ جیسے شاعر نے تشیلی آواز میں دہرایا "تم مجھ سے محبت کرنے لگ گئی ہو" جواب میں اس نے ایک ہلکی سی سسکی کے سوا کچھ نہ سُنا۔ اس نے اصغری کو اپنے قدموں پر سے ہٹایا۔ اس لئے نہیں۔ کہ اُسے اس فاتحانہ انداز میں کھڑے رہنے سے ایک نشہ سا آرہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے تئیں ایک فاتح نہیں بلکہ شکست خوردہ سمجھ رہا تھا۔ ایک لڑکی نے آج اُسی کے قدموں پر گر کر اُسے شکست فاش دی تھی۔ اس نے اُن الفاظ کی سچائی کو محسوس کر لیا تھا جو زبان سے ادا نہیں کئے گئے تھے.......... محبت.........

اس لفظ کا اس پر کس قدر گہرا اثر ہوتا تھا۔ اگر اصغری اُسے وہ خطوط دکھا کر اپنی صفائی پیش نہ کرتی۔ اور تب بھی اُسے سچے دل سے ایک دفعہ کہتی۔ کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں" تو وہ اس کی تمام برائیوں کو بھول جاتا۔ کیونکہ شاعر سمجھتا تھا۔ کہ سونا خواہ کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ جب بھی وہ

آگ میں پڑے گا۔ تو کندن ہی بنکر نکلے گا۔ اس کے نزدیک ایک بازاری عورت کا بھی سچے دل سے محبت کرنا اُسے زمانہ بھر کی عورتوں سے پاکیزہ تر بنا دینے کے مترادف تھا۔

اس وقتی کیفیت سے جب شاعر نے چھٹی پائی۔ تو وہ اپنے دل میں تمام حالات کا صحیح نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے کئی امور کا دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ لیکن یہ بات تو اس نے قطعی طور پر طے کر لی کہ وہ اصغری کو کسی دھوکہ میں مبتلا نہ رہنے دیگا۔ اور اسے صاف صاف کہہ دیگا۔ کہ وہ کسی سے محبت کر چکا ہے اور اب بھی کرتا ہے۔ البتہ اصغری کی محبت کے پاک جذبہ نے اس کے دل میں ایک جوابی جذبہ ضرور پیدا کر دیا ہے۔ جسے احترام کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ احترام اس قدر زیادہ ہے۔ جو محبت سے کسی طور کم نہیں۔

اصغری نے جب یہ سب کچھ سنا۔ تو وہ ہنس دی۔ اس نے کھڑکی سے اپنا بیضوی چہرہ باہر نکالا۔ جو دسویں کے چاند کی چھٹکی ہی روشنی میں نرگس کی پتیوں کی مانند سفید و نازک نظر آنے لگا۔ اس کے دماغ میں چند ہی ساعتوں کے اندر اندر گذشتہ واقعات بھر گئے۔ کس طرح بیسیوں حسین و دولت مند نیز جو ہر لحاظ سے بہترین نوجوانوں نے اس سے محبت کا دم بھرا۔ اور خصوصاً وہ نوجوان -------- جس کے جذبہ میں اس قدر آنچ تھی۔ کہ اس کی گرمی نے اس کے دل کی سختی کو بھی پگھلا دیا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ اس کی محبت سچی ہے

اس کی قربانیوں نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور وہ اس نوجوان کی محبت کا اس قدر احترام کرنے لگ گئی تھی۔ کہ اُسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ بھی اس سے محبت کرنے لگ گئی ہے .... اور پھر وہ وقت آیا۔ جب شاعرِ خاورِ تاباں کی مانند اس کی اندھیرے سے گھری ہوئی زندگی میں طلوع ہوا۔ اور .... اُسے پہلی بار محسوس ہوا۔ کہ محبت کسی جوابی جذبہ کا نام نہیں۔ محبت زبردستی کرائی نہیں جا سکتی۔ بلکہ خود بخود انجانے میں ہو جاتی ہے۔ اور اس میں کسی جوابی تعاون کو دخل نہیں ...

..... آہ۔ ایک نوجوان اس پر جان چھڑکتا ہے۔ اور وہ اس سے محبت نہیں کر سکی۔ اور تقدیر نے کس بے دردی سے اُسے ایک نوجوان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ جو کسی اور سے محبت کرتا ہے ...

.... وہ ایک بار پھر ہنسی۔ اُسے اُس بدقسمت نوجوان کی دردناک حالت کا صحیح اندازہ آج ہی ہوا۔ جس کی محبت کا جواب وہ نہ دے سکی تھی۔ گویا قدرت نے اسی بات کا انتقام اس سے لیا تھا۔ اُسے اس نوجوان کی حالت پر رحم آگیا۔ لیکن محبت .... اس کا رُخ کوشش کرنے پر بھی وہ اس نوجوان کی جانب نہ پھیر سکی۔ گویا اس کی محبت ایک چڑھی ہوئی ندی تھی۔ جس کا رُخ ایک بار جس جانب پھر گیا بس پھر گیا۔ خواہ وہ علاقہ ریگستان ہی کیوں نہ ہو جس میں سر ٹیک ٹیک کر ختم ہو جانے کے سوا اُسے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ ظاہری بات ہے مگر بھی وہ اس سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکی۔

شاعر نے چند ہی روز میں دیکھ لیا۔ کہ اصغری کی محبت قائم بالذات ہے۔ اُسے شاعر کی "ہاں" یا "نہ" سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ عالم دیکھکر شاعر پر پھر سے ایک شیطانی خیال غلبہ پانے لگا۔ اُس نے اس خیال کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دینے کا عزم کیا۔ وہ اصغری کی محبت سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا۔ کہ وہ اس کے متعلق کوئی بُری بات سوچنے کو بھی تیار نہ تھا۔ لیکن جیسے کوئی اُس کے کان میں بیٹھا بیٹھا کہہ رہا تھا۔ کہ جس کام میں اپنی تمام طاقت خرچ کر کے بھی تو کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ اب محبت کے جھانسے میں آ کر کسی خاص محنت کے بغیر پورا ہوا چاہتا ہے۔ محض قدم اٹھانے کی دیر ہے کہ منزل تیرے سامنے ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گناہ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں یہ گناہ نہیں۔ محبت میں کچھ بھی گناہ نہیں ہوتا۔" شاعر نے اس نادیدہ صلاح کار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ اگر اس کے لئے گناہ نہیں۔ تو کم از کم میرے لئے تو ہے۔ میں اس کی محبت کا جواب نہیں پیش کر سکتا۔ میں تو کسی اور کی وفاداری کا دم بھر چکا ہوں ـــــــ پھر ـــــــ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔

شاعر نے شیطان پر فتح پالی۔ اس نے ان خیالات کو اپنے دل سے بالکل نکال دیا۔ لیکن ـــــــ جس ہوس کو اصغری کے مسلسل انکار نے نشو و نما دی تھی۔ اس کی جڑیں دل کی انتہائی گہرائی تک اتر چکی تھیں۔ اُسکو اس آسانی سے ملیا میٹ کر دینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ قصہ مختصر کہ انتہائی ضبط کے باوجود وہ اصغری کے سامنے ایک بار پھر اس خواہش کا اظہار کرنے سے نہ

رہ سکا۔ اس نے وہی جواب دیا۔ جس کی توقع تھی کہ "یہ گناہ کیوں خواہ مخواہ اپنے سر چڑھاتے ہو" جیسے شاعر کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کہ وہ انکار کر دے۔ گویا شیطان کے سامنے اُسکے شکست خوردہ ضمیر کو اصغری کے انکار نے ایسی مدد پہنچائی۔ کہ اس نے شیطان کو بھگا دیا لیکن شکست کھا لینے کے بعد بھی فتح پا لینا شیطان ہی کا کام ہے۔ بھاگتے بھاگتے وہ نہ جانے اس کے کان میں کیا پھونک گیا۔ کہ جیتا ہوا ضمیر پھر شکست کھا گیا اور شاعر نے دلائل کا سہارا لیتے ہوئے کہا "گناہ ——— محبت میں کوئی شے گناہ نہیں۔ اور پھر محبت کا مجازی معراج بھی تو یہی ہے ———" شاعر کہنے کو تو یہ کہہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی حقیقی آرزو یہی تھی۔ کہ اصغری قطعاً انکار نہ دے۔ لیکن ——— اصغری نے سر جھکا دیا۔ گویا ایک خاموش زبان نے "ہاں" کہہ دیا۔ شاعر کے جذبات کی راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کسی نے اس زور سے پھونک دی۔ کہ شعلے بھڑک اٹھے۔ اس کا ضمیر شکست فاش کھا گیا اور اصغری سر جھکائے سوچ رہی تھی "محبت کا معراج .... تو کیا اسکے دل میں بھی محبت جاگ اٹھی ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ میری محبت نے آخر اسے مجبور ہی کر دیا۔ چنانچہ محبت کے اس تازہ جوڑے کو چوما گچ کرنے کا یہ سنہری موقعہ ...." اصغری یہ سوچتی ہی رہ گئی اور شاعر ....!! باہر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریب کے ایک صنوبر پہ پرندوں کا ایک جوڑا پھڑ پھڑا کر ایک دوسرے کے ساتھ سٹ گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اصغری اپنے اونچا پہننے والے سر کو اسطرح جھکا
بیٹھی تھی۔ گویا وہ اُسے اپنے شانوں کے اندر پیوست کر دینا چاہتی ہے
کے چہرہ پر شکست و شرمندگی کا احساس لالی کی صورت میں نمایاں تھا۔
اس کی نیلی آنکھوں میں ایک میٹھی سی چمک اس کامیابی کی مظہر تھی جو
شرمندگی کی قیمت پر حاصل کی گئی تھی۔ اس کی عرق آلود پیشانی دو متضاد
جذبات کی کشمکش کا منظر پیش کر رہی تھی۔

شاعر کی حالت اُس شریف انسان کی مانند تھی۔ جو کسی وقتی جوش
مغلوب ہو کر ایک قتل کر بیٹھا ہو۔ لیکن جب وہ جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے!
اپنے سامنے ایک چھٹپٹاتی ہوئی لاش دیکھتا ہے۔ تو اس منظر کی تاب
سر سے پاؤں تک تھر تھرا جاتا ہے۔ اس مرنے والے کی بے بسی پر اسکے آ
نہیں رکتے۔ اور قاتل کے لئے اس کے دل سے ایک بددعا نکلتی
شیطان اپنی کامیابی پر ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اسکا شکست خ
ضمیر پھر جاگ اٹھتا ہے۔

شاعر ایک گناہگار کی مانند اس لڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کا
کچھ اُس نے چھین لیا تھا۔ اُسے محسوس ہو چکا تھا۔ کہ جس روز اس نے
اپنی شکست کھایا ہوا سمجھا تھا۔ اُس روز درحقیقت اس کی فتح ہوئی تھی
آج جبکہ اس نے اپنی دانست میں فتح حاصل کر لی تھی۔ اس کی دائمی شکست
کا دن تھا۔ اس کے تھرتھراتے لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اور ایک صدا
"یا خدا مجھے معاف کرنا"۔ اگر قریبی میز کا سہارا نہ ہوتا۔ تو وہ فرش پر آ رہتا

دیر بعد وہ پھر سنبھلا۔ اور اصغری کے قریب آیا۔ دونوں تھرتھراتے ہاتھوں سے اسکا تمتماتا چہرہ تھام کر اوپر کو اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اصغری نے ہاتھ سے اُسے پرے دھکیل دیا۔ شاعر کے ہاتھ چھُٹ کر بے جان بازوؤں کے سہارے نیچے کو لٹک گئے۔ لیکن اصغری نے گرتے ہوئے ہاتھ تھام لئے ایک ساعت انہیں پکڑے دیکھا۔ سانپ کی برقی نگاہوں سے مسحور ہو گیا پرند اڑنے کی کوشش کے باوجود جب اس کے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اسوقت اس کی نگاہوں سے جو بے بسی ٹپکتی ہے۔ اُسی بے بسی سے لدی ہوئی نگاہیں اٹھا کر اُس نے ایک بار شاعر کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں اس نے اپنے پھڑکتے ہوئے لب اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ اور اُن دونوں ہاتھوں کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اپنی تمام طاقت لگا کر اس نے اپنی زبان کا قفل کھولا۔ لیکن محض اتنا ہی کہہ پائی "اب میرا تمہارے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔ یہ بات بھول نہ جانا"........ اس بات نے شاعر کو سُن کر دیا۔ چند لمحے تو وہ اس طرح ساکت و صامت رہا۔ گویا ایک لمحے جان بت کھڑا کر دیا گیا ہو۔ جب اس کے حواس پھر برقرار ہوئے۔ تو اس نے دیکھا کہ ابھی تک اس کے دونوں ہاتھ کسی کے سینے سے لگے ہوئے ہیں۔ جس کی تیز دھڑکن بجلی کی رو کی طرح اس کی انگلیوں کے پوروں سے گذرتی ہوئی اسکے سر سے پیر تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ایک ٹھوکر کھانے والے شخص کی مانند لڑکھڑایا۔ اور گھٹنوں کے بل آ رہا ——— لیکن اصغری نے اسکے ہاتھ اپنے سینے سے نہیں ہٹائے۔

"میں نے گناہ کیا ہے۔ اصغری۔ یہ میرے لئے اچھا نہ تھا۔ ایک فاشعار سے میں نے بے وفائی کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہارا بھی گناہگار ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اصغری کے لبوں پہ ایک ہلکا سا تبسم رقصاں تھا۔ گو اُسکے چہرہ پر شرمندگی کے آثار موجود تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے ہاتھوں کو اپنے سینے سے جدا نہیں کیا۔ گویا اس نے اپنا سب کچھ دے کر جن ہاتھوں کا سہارا پایا تھا۔ انہیں اب وہ ہمیشہ کے لئے اپنے سینہ سے چمٹائے رکھنا چاہتی تھی۔ شرمندگی کے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے اس نے شاعر کی پشیمانی کو وہ تنکا سمجھا۔ جس نے اس کو سہارا دیا لیکن شاعر کہہ رہا تھا " مجھے اس وقت جانے دو۔ اصغری پشیمانی نے میری روح کو بے چین کر رکھا ہے " شاعر نے ہاتھ چھڑائے اور درختوں کے قریبی کنج کی اندھیاری میں کھو گیا۔ اصغری کی مسکراہٹ معدوم ہو چکی تھی سامنے چاند پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا اور ستارے تو گویا آنکھ میچ میچ کر اصغری کے متعلق چند رازدارانہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔

اصغری نے اس کنج کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے کئی راتیں بتا دیں۔ جس میں شاعر غائب ہو گیا تھا۔ لیکن جانے والا لوٹ کر نہ آیا۔ چاند نے اسکی راہ میں چودہ راتوں تک روشنی کی۔ اور آخر انتظار سے تھک کر وہ بھی کہیں چلا گیا۔ لیکن اصغری انتظار سے نہ تھکی۔ اس کا انتظار آنسوؤں کے سوا کوئی پھل نہ لا سکا آخرکار ایک رات جب اندھیرے میں دیوار کے لمبے تڑنگے

درخت بھوتوں کے سائے ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ اور رہ رہ کر کسی اُلّو کی کرکش آواز اچھے بھلوں کے رونگٹے کھڑے کئے دیتی ہے۔ وہ نازنین اپنے چراغ رُخ زیبا کی مدد سے اُس چور کو ڈھونڈنے نکلی جو اس کا سب کچھ لے گیا تھا۔

شاعر کو اس نے کوئی طعنہ نہیں دیا۔ اس سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ اُسے دیکھ کر اس کے دل میں جذبات اور ولولوں کا وہ طوفان اُمڈ آتا تھا۔ جو ایک ہی گلہ میں تمام گلے شکوے بہالے جاتا تھا۔ یہ وہی طوفان تھا جس کی پُرشور لہریں خود اصغری کو ایک بے جان لاش کی مانند اِدھر سے اُدھر اپنے ریلوں میں اٹھائے پھر رہی تھیں۔ وہ محض اتنا کر پائی۔ کہ اس نے اپنا سر شاعر کی چھاتی پر رکھ دیا۔ لیکن شاعر نے وہ سب کچھ سن لیا۔ جو اس کی زبان ادا نہ کر سکی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ اس اندھیری رات میں اصغری کا اسکے کوارٹر تک چلے آنا ہی ایک دلدوز طعنہ تھا۔ جس کے جواب میں وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

"اصغری۔ تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ تمہاری محبت کا مجھے احترام ہی نہیں بلکہ میرے جذبات احترام کی حدود لانگھ کر محبت کی وادی میں داخل ہو چکے ہیں .... لیکن .... ڈرتا ہوں کہ اگر ایک سے میں نباہ نہ سکا۔ تو تجھ سے کیا .... خدا کے لئے .... خدا کے لئے اصغری تمہارے قرب سے ایک روحانی شرمندگی کا احساس میرے لئے سوہان روح ہے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو .... میں تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا

مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔۔" اصغری اس سے پرے ہٹ گئی۔ شاعر نے تصور کی آنکھوں سے اس چپ کی گہرائی ناپی۔ جو اس نے اصغری کے دل پہ لگا یا وہ اس پہ پھاہا رکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اُسے اپنی حقیقی کیفیت کھولنی ہی پڑی "شاید تم نہیں جانتیں۔ کہ میری باتیں خود میرے لئے کس قدر پُر عذاب ہیں۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ گناہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میں نے اپنے لئے یہ سزا تجویز کی ہے۔ تم یقین جانو۔ کہ تمہیں دیکھے بغیر میں پچھلی چودہ راتوں میں سو نہیں سکا۔ لیکن یہ عذاب مجھے برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اسوقت تک۔ جب تک وہ ــــــــ جس کا میں نے گناہ کیا ہے مجھے معاف نہیں کر دیتی۔۔۔۔۔۔ اگر تمہیں میری بات پر اعتبار ہو۔ تو یقین رکھو۔ کہ وہ کبھی ناراض نہیں ہو گی۔ میں اُسے بخوبی جانتا ہوں وہ تمہیں اس ملاپ پر مبارک کہے گی۔ میں جانتا ہوں۔ میری" رانی" ایسی نہیں ہے "۔ شاعر نے محسوس کیا۔ کہ جُوں جُوں وہ اپنی" رانی" کے جذبہ بخشش کا خیال کر رہا ہے۔ اس کی وہی کمزوری جاگ رہی ہے جس نے اُسے ایک بار گڑھے میں گرایا ہے۔ وہ پھر سنبھل گیا۔ اور اصغری سے اُسی پہلے لہجہ میں کہنے لگا" مجھ پر رحم کھاؤ۔ مجھے اسوقت چھوڑ دو"۔ اصغری چپ چاپ واپس چلی گئی۔ وہ کیا کچھ نہیں کہنے آئی تھی۔ لیکن ایک لفظ تک اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ البتہ جاتے ہوئے بار بار اسکی زبان پر یہ مصرعہ آیا۔

مصرعہ۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

شاعر کے کمرہ میں رہنے والے دونوں ساتھیوں کا جھگڑا مٹ چکا تھا۔ فیض احمد نے بھی مان لیا تھا۔ کہ اصغری یقیناً ایک سیاہ کار لڑکی ہے۔ اس وقت شاعر پرلے کونے میں بیٹھا "نفس کے ہاتھوں انسانی شکست کی ٹریجیڈی" کے موضوع پر کسی فرانسیسی فلسفی کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

ٹنگمرگ۔ ستمبر ۱۹۴۱ء

موت کے بستر سے

(تپِ دق کے ایک مریض کی ڈائری)

(میری بیماری کے دنوں میں یہ ڈائری مختلف ادبی رسائل میں بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ اُن دنوں میں نے ذاتی طور پر جو حواشی دیئے تھے۔ انہیں بعینہٖ رہنے دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اُس مایوسانہ ذہنیت کو بہت حد تک اجاگر کرتے ہیں جس کا مطالعہ کرنے کی کوشش اس میں کی گئی ہے۔ س)

یہ ڈائری محض "شاعر کا تخیل" نہیں، بلکہ نفسیات کی حقیقت کا مطالعہ ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کے سامنے کچھ پیش کر سکے یا یہ پارا مجھے ہچمدان کو نہیں، البتہ انسانی نفسیات کے طالب علم

کو اس میں بہت کچھ ملے گا۔ یہ اُس شخص کے جذبات کا مرقع ہے جو موت کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کسی بھی وقت قضا کی کمان سے کسی جان لیوا تیر کے نکلنے کا منتظر ہے۔ انسانی بنیاد کس قدر کھوکھلی ہے۔ ع

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بُلبُلا ہے پانی کا

اور پھر جب اس کھوکھلی بنیاد کو بھی گھن لگ جائے تب اس کی حقیقت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ یہ وہ جانتا ہے، اس میں کسی جذبہ کی غلط تصویر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہاں یہ ہم یہاں و ہاں مزاج یا تخیل سے رنگ دیا گیا ہے۔ کیونکہ عموماً۔ ع

لگا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے

چند ایسے قابلِ ذکر واقعات بھی ہیں جن کا ڈائری میں کھُلم کھلا اعتراف ناگوار ہے۔ اگر اس "ملک الموت" نے جلد ہی کوچ کا نقارہ نہ بجا دیا تو غالباً انہیں افسانوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔ بہرحال اس "زندان شاہی" میں پڑے پڑے ڈائری کے اوراق تو پُر کرتا ہی رہونگا۔

رامانند ساگر
(۲۱ جون ۱۹۴۱ء)

یکم مئی ۱۹۴۱ء

جب سے یہ پتہ چلا کہ میں ایک "تپدق" کا مریض ہوں۔ ایک عجیب کیفیت طاری رہی ہے۔ ماضی اپنے دامن میں میری تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے لئے نہایت بیدردی سے مسکرا رہا ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے جیسے کسی انجان کسان نے اپنی تمام محنت ایک ایسے میدان کو سیراب کرنے میں صرف کر دی ہو۔ جس میں حسرت کے پودوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔

مستقبل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس موذی اور ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑنے والے مرض کے متعلق میں نے آجتک جو کچھ پڑھا یا سنا وہ سارا علم خیالات پریشان کی صورت میں مستقبل کو تاریک کئے ہوئے ہے۔ یاس کی گھٹاؤں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن واہ ری اُمید ——— اس نے ابھی تک ایک ننھا سا چراغ وہاں جلا رکھا ہے۔ لیکن اکیلا چراغ رات کی تاریکی کو زیادہ خوفناک بنا دیتا ہے۔ اسیطرح بچ رہنے کی یہ امید مستقبل کو زیادہ پریشان کن بنا رہی ہے۔ اگر تپدق کا مریض وقتی طور پر بچ بھی رہے تو کیا، عمر بھر کے لئے داغدار ہو جاتا ہے۔ یوں کہو کہ قدرت نے ایک "تیر نیم کش" چھوڑا ہے جس کی خلش اب تا حیات نہ جا سکے گی۔ ایک عجب کیفیت ہے، گویا میرا مہدِ حیات زندگی اور موت کے ہچکولے کھا رہا ہے۔

آج ہمارے کالج کے وائس پرنسپل جناب احمد غریب نواز نے میرے غریب خانہ کو بھی نوازا، بہت کچھ دلاسا دیا جس سے گرتی ہوئی امید پھر سنبھل گئی۔ بہرحال

دنیا بہ امید قائم است

۴ مئی

یکم مئی کو لاہور سے چلکر آج رات سرہند پہنچا۔ لاہور سے روانگی کا نظارہ تصور میں آتے ہی آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ دوستوں کا ہجوم اور پھر اس مجمع پر یہ خیال غالب کہ "مبادا یہ ہماری آخری ملاقات ہو" اس جذبہ کی موجودگی میں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسطرح سارے کا سارا مجمع مجھے آنسوؤں سے لدا ہوا ایک بادل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوستوں کا منہ پھیر کر آنسو پونچھ لینا اور پھر میری طرف ہنستے ہوئے دیکھنا وہ اپنی دانست میں مجھے بنا رہے تھے لیکن درحقیقت میں انہیں بنا رہا تھا۔ میں انکی ہنسی کے پس پردہ چھپا چھم چھم برستے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کھل کر بات نہ کرنے پاتا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ انکے گلے آنسوؤں سے بھر آئے ہیں۔ اس منحوس بیماری کا خیال بھی مجھے جس قدر پریشان نہ کر سکا اس سے زیادہ تکلیف مجھے اس رقت خیز نظارہ نے پہنچائی۔

اس وقت جب کہ موت کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے پایا تو میری آنکھوں پر سے ایک پردہ سا اٹھ گیا۔ میں نے دوستی کی حقیقت پالی۔ مجھ پر اس راز کا انکشاف ہو گیا۔ کہ مرتے وقت انسان کے لیے اگر کوئی خیال راحت کا باعث ہوتا ہے تو وہ یہی کہ کسی سچے دوست کی دوستی آخر تک اسکے شامل حال رہی۔ اور یہ امید کہ "میرے بعد بھی اس کی دوستی مجھے دغا نہ دے گی"! اس حقیقت کا انکشاف مجھ پر ہوا بھی تو کس وقت۔ ع

بعد مردن گر کوئی بالائے بام آیا تو کیا

۵ مئی :

کشمیر کا موسم خوب ہے۔ تڑاکے کی دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے کہ نا گہا
آسمان کے دامے پر چوٹ پڑتی ہے۔ باہر جھانک کر دیکھتے ہیں تو چاروں طرف
سے گھنے بادل سورج پر یلغار کرتے نظر آتے ہیں۔ بعینہٖ میرے دل کی کیفیت
ہے۔ بچوں سے کھیل رہا ہوتا ہوں کہ اچانک انکے مستقبل کا خیال آتے
دل مغموم ہو جاتا ہے۔

۶ مئی :

میرے عزیز ترین دوست طاہر کی چھٹی آئی ہے۔ اسکے جذباتی
نے کچھ اس طرح دل کے تاروں کو چھیڑا ہے۔ کہ ایک پرسوز نغمہ گونج
ہے۔ اور ایک رقاصہ کے از خود تھرک اٹھنے والے پاؤں کی مانند دو
آنسو بھی آنکھوں کے پردوں میں تھرکنے لگے ہیں۔ ایک شوخ اور
سا بادل دھوپ میں نہا رہا تھا۔ کہ اس نظارے کی تاب نہ لا کر وہ
بھی رو دیا۔

۷ مئی :

طبیعت میں قدرے شگفتگی ہے۔ تپدق بھی ایک شاہی مرض ہے
پہلے محنت مزدوری کرتے انسان پر جب ڈاکٹر یہ فتوےٰ صادر کر دیں کہ
تپدق ہو گیا ہے تو سمجھو اسکے نصیب کھل گئے۔ جیسے ایک چھوٹی موٹی ریا
مل گئی ہو۔ اُسے ایک قدم تک چلنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بیٹھے بٹھائے ہر طرح
کا آرام وہیں میسر آ جاتا ہے۔ بہتر سے بہتر کھانا ملتا ہے۔ پہننے کو اچھا اور

ایک پر حکمرانی۔ درحقیقت تمام شاعروں کو اس شاعرانہ مرض میں مبتلا ہو جانا چاہیئے۔ انہیں دنیا کے تفکرات سے جس قدر بے نیازی کی ضرورت ہے، وہ حضور "تپدق" والا شانہ ہی کا دامن تھامنے سے میسّر آسکتی ہے۔

۱۰ ر مئی:-

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرض میں محض مزے ہی مزے نہیں بلکہ ان پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ یعنی بیوی سے جبری جدائی۔ آپ لاکھ کہئیے کہ صاحب ہمیں بیوی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے ہم اُسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن وہاں سنتا ہی کون ہے۔ تپدق کیا لگ جاتا ہے گویا مارشل لاء لگ جاتی ہے۔ اور بیوی کی وقعت غیر ملکی ڈاک کی چٹھی سے کچھ زیادہ نہیں ہوتی کہیں کسی طرح سسرال کے غیر ممالک سے آبھی جائے تو ہماری راجدھانی میں پہنچتے ہی سنسر کی نذر ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں براہ کرم ہم تک پہنچائی بھی جائے تو جسطرح سنسر شدہ خط کی بعض سطور کو مٹا دیا جاتا ہے اسیطرح اسکی ملاقات پر پابندیاں لگ جاتی ہیں۔ کہ زیادہ بات چیت نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کے قریب سٹ کر نہیں بیٹھ سکتے تنہائی میں نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک دوسرے سے اپنا رازِ دل نہیں کہہ سکتے۔ غرضیکہ کونسی پابندی ہے جو نہیں لگائی جاتی۔ گھر والوں کو مریض کا جسم پیارا ہوتا ہے۔ اس کے جذبات نہیں۔ کون ہے جو مریض کی زبان سے انہیں نظیری کا یہ شعر پڑھ کر سنائے:-

ے ترکِ شراب و شاہدم بہار کرد ست اے طبیب
صحت نخواہم یا فتن تا نشکنم پرہیز را

۱۲ - مئی :

ان مزاج پرسی کے لئے آنے والوں سے خدا نپٹے۔ خصوصاً جب وہ کوئی عورت ہو۔ مریض کی طبیعت اچھی بھلی ہوتی ہے کہ ان کی بے موقعہ ہمدردی نئے سرے سے اسکو پریشان کر دیتی ہے کس کس انداز سے۔ اور کتنی کتنی کوششوں سے آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں باتیں کیا کرتی ہیں۔ کہ مریض کے زخموں پر چرکے لگاتی ہیں۔ "ان ننھے ننھے بچوں کا خیال آرہا ہے انکا تمہارے سوا ہے کون۔ دیکھو نا ابھی سے انکے چہرے اُتر گئے ہیں اس ننھے کو تو دیکھو کسطرح حسرت بھری نگاہوں سے تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ اس بیچاری کو دیکھو اس پر تو گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ننھی سی جان ابھی اسکے کھیلنے کے دن تھے......" غرضیکہ سنتے سنتے آپ کو اپنا زندہ ہونا بھی مشکوک دکھائی دینے لگے گا۔ مجھے جب کسی ایسے تیماردار کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میں دیوار کی جانب منہ پھیر لیتا ہوں۔ دیوار پر میں نے جوش کا یہ شعر لکھ رکھا ہے۔ اسی کو پڑھ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔ ع

کیا نزع کی تکلیفوں میں مزا جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہوا

۱۴ - مئی :

آج تمام دن کچھ ایسے واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے کہ بار بار مجھے کہنا پڑتا تھا۔ ع

"اتفاقات ہیں زمانہ کے"

ہیں لالہ لاجپت رائے کے خود نوشت "حالات جلا وطنی" پڑھ رہا تھا جنہیں کل صبح ہی ختم کیا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ چند ہی گھنٹے بعد مجھے بھی بعینہ انہی حالات میں قطعاً غیر متوقع طور پر گھر سے "جلا وطنی" کے ناگہانی احکام سننے ہونگے ڈاکٹروں نے مجھے فوراً سرکاری سینے ٹوریم میں لے جانے کا حکم سنایا۔ اس ناگہانی ابتلا نے مجھ پر جو اثر کیا وہ قلمبند نہیں کیا جا سکتا۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ کسی کی جدائی کے خیال نے بستر پر کانٹے بچھا رکھے تھے، آج بہت سویرے سینی ٹوریم کی طرف روانہ ہوئے، یہ سینی ٹوریم وادیٔ کشمیر سے اڑھائی ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پہاڑ کے پہلو میں چیل کے گھنے جنگلوں کے درمیان واقع ہے۔ موٹر جوں جوں بلندی پر جا رہی تھی نیچے وادیٔ کشمیر کا منظر کھلتا جا رہا تھا۔ میری نگاہیں بار بار اس اتنی مبیر لمبی وادی میں دور کہیں کسی اپنے "کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

آخر کار سینے ٹوریم میں پہنچے، یہاں ایک اور دلچسپ اتفاق پیش آیا۔ سینی ٹوریم متعدد چوبی جھونپڑیوں پر مشتمل ہے جو ٹاپوؤں کی طرح ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ ایک کمرہ میں دو مریضوں کے بستر ہوتے ہیں۔ جو نہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ عین اسی وقت ایک اور مریض کو بھی اسی کمرہ میں جگہ دی گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو خود بخود تسلیم کے لئے جھک گئے میرا ساتھی کوئی نیا نہ تھا۔ آج سے آٹھ سال قبل ہم دونوں ایک ہی کالج میں ایف۔ اے کی جماعت میں اکٹھے تھے۔ آٹھ سال سے ایک دوسرے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ آخر قدرت نے ہمیں ملایا۔ لیکن کہاں! اور کس صورت میں؟ اس پر لطف

زائد یہ کہ میرے ہمنشیں کا مرض بھی اسی مرحلہ پر ہے جہاں میرا۔ ابھی میں اس درد آمیز دلچسپی سے پوری طرح محظوظ نہ ہونے پایا تھا کہ مزید انکشافات نے مجھے حیرت کے مارے بت بنا دیا ——— حیران ہوں کہ اس کے اور میرے حالات کس قدر مشابہ ہیں۔ اس کی ماں بھی اُسے بچپن ہی میں اس کے باپ کے حوالے کر کے چل بسی اور اُس کے باپ نے اُسے ایک اور ماں لا دی ہے ملازمت کے سلسلہ میں وہ بھی اپنی بیوی سمیت گھر سے کہیں دور رہتا تھا۔ کہ اچانک ارکانِ قضاوقدر اس کی ہنستی دنیا دیکھ کر جل اٹھے اور اپنی کمان پہ چلّہ چڑھا کر وہ تیر چھوڑا۔ جس کا پھل اس کے پہلو ہی میں ٹوٹ گیا۔

ان امور کے پیشِ نظر یہ خیال بار بار آ رہا ہے کہ کیا ہم دونوں کا انجام بھی ایک سا ہوگا۔ یا کہیں قدرت نے ہمیں اسی انجام کے لئے اکٹھا تو نہیں کیا؟ بہر حال آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے :۔ اتفاقات ہیں زمانہ کے

۱۵ مئی :———

آج سینے ٹوریم میں میرا دوسرا روز ہے۔ میری منظر پرست آنکھیں آج ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ پا سکیں۔ ایک منظر سے ابھی نگاہ سیر نہیں ہونے پاتی کہ دوسری طرف کا منظر دامن تھام لیتا ہے۔ ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

یہاں کا تخیل خیز جنگل سینے ٹوریم کے پہلو میں بہتا ہوا ترنم ریز نالہ جو کسی شوخ حسینہ کی طرح ہر سنگِ راہ کو ٹھوکریں مارتا اور مچلتا ہوا اچھلا جا رہا ہے اپنے

عشاق کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنے کی جیسے اُسے فرصت ہی نہیں، یہ جگہ بادلوں کی گویا سیر گاہ ہے۔ شاید کہیں پاس ہی میخانہ ہے کہ جو بادل آتا ہے جھومتا ہوا مستی کے مارے اس کا پاؤں ہی زمین پر نہیں لگتا۔ ننھے ننھے بادل ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی کوئی تو اپنی شرارت کی سزا پاکر پہاڑ سے ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتا ہے۔

سورج اس "معشوق پس پردہ" کی مانند ہے کہ جس کی پازیب کی جھنکار سے ہی اس کا وجود قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور تصوّر ہی تصوّر میں اسکے نظارۂ سوز جلوہ سے دل کو تسکین دی جاتی ہے یعنی کبھی کبھی ان شریر بادلوں کی نظر چھپا کر کوئی سنہری لباس والی نازک اندام کرن یہاں کے سبزے پر ایک بار لوٹ جانے کے لئے بھاگ آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سورج بھی ہے۔ سامنے گلمرگ کی چوٹی اور اس کے عین اوپر کھلن مرگ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی اپنی رعنائی پہ نازاں غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہے۔

یہ چوٹی کیا ہے ایک بت ہرجائی ہے کہ اپنا سفید برفانی چہرہ کھولے کچھ اس انداز سے کھڑی ہے کہ ہر راہگیر بادل اس سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ اسمیں حسینوں کی مکاری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اپنا وسیع دامن پھیلا رکھا ہے اور ہر لپٹنے والے کی گرہ کھول کر کچھ اس طرح نقرئی برف کے تودوں کے تودے نکال لیتی ہے کہ اُسے کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے نقصان سے بے خبر اپنی کامیابی پر اتراتا ہوا اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ کئی ننھے بادل تو اس عیّارہ پر کچھ اس طرح فدا ہوتے ہیں کہ اپنا سب کچھ اسی

کے حوالے کر جاتے ہیں۔ لیکن کئی ایسے بھی رند ہیں جو دُور ہی دور سے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اور گالوں کی چٹکیاں لے لیتے ہیں ۔ اور ہنستے ہوئے نکل جاتے ہیں ۔

آسمان کی جانب سے نگاہ ہٹتی ہے تو نیچے بہت دور بہتا ہوا دریا ہے جس کی بل کھاتی ہوئی سفیدی اس قدر اونچائی سے ایک عجب بہار دکھا رہی ہے ، غرضیکہ ایک ایسا نظارہ موجود ہے جس کو بیان کرنے کا کم از کم میرے قلم کو تو یارا نہیں ۔ البتہ شاعر کے قلم پہ بھروسہ کر کے اسی کے چند اشعار میں اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ حفیظ

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیواروں کی بزم آرائیاں
بنتے بنتے چلنے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا

ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئیں
کسمساتی ، لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئیں
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئیں
اپنی اپنی منزل مقصود کو جاتی ہوئیں
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنّت نشاں
ورنہ جنّت میں یہ حسن و رنگ شادابی کہاں
کیا ہے جنّت چند حوریں اک چمن دو نہریاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں
عالم بالا پہ ہے پرتو اسی کشمیر کا

۱۸ مئی :۔

اس جگہ قدرت نے جس قدر فیاضی سے کام لیا ہے۔ کاش مقامی حکومت اس سے آدھی فیاضی سے کام لیتی، لیکن وہ تو شاید قدرت کی لامحدود سخاوت کا پلّہ برابر کرنے کے لئے مریضوں کی دیگر ضروریات کے بارے میں بخل سے کام لینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ یہاں تک کہ اس سال گذشتہ سالوں کے مقابلہ پر نصف خوراک دی جاتی ہے۔ حکام کا یہ خیال شاید کچھ بیجا بھی نہیں کہ قدرت کے مسحور کن نظاروں سے جی بھر کر سیر ہو جانے کے بعد کھانے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔

اور تو اور یہاں کوئی خوبصورت نرس تک نہیں۔ مجھے یاد آتا ہے جب کبھی خوش قسمتی سے ہمارا کوئی دوست یا رشتہ دار بیمار ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوتا تھا تو اسے رشک حور نرسوں کے ہاتھوں دوائی پیتے یا اُن کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے بیٹھتے دیکھ رشک کے مارے اپنے آپ پر غصہ آتا تھا کہ کمبخت ہمیں تو کوئی بیماری بھی نہیں لپٹتی۔ اب دیکھئے کہ "بیماریوں کی سرتاج"، موئی لیکہ "شاہی مریض" بھی بنے ہیں۔ لیکن اس

قدرت ربانی کرنے پر بھی ہمیں کوئی خوش مثال نہ مل سکی۔ خیر لیں نہ سہی تصور ہیں ہی سہی۔

اے دل بلا سے اس قدر فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہو تصورِ جاناں کئے ہوئے

۲۰ مئی:

آج میرے ہمنشیں کا والد سات روز کے بعد پہلی مرتبہ اُسے ملنے آیا۔ اپنے بیٹے کے تئیں اس کی روکھائی دیکھ کر میرے دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ اس کی باتیں کسی دشمن سے بھی زیادہ کڑوی تھیں۔ آج مجھے اس مقولہ پر یقین آگیا۔ کہ "سوتیلی ماں کے آنے پر باپ بھی سوتیلا ہو جاتا ہے" حالانکہ میرے سامنے چند زندہ مثالیں اس مقولہ کے رد کے لیئے موجود ہیں۔ لیکن آج کے واقعہ نے میرے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیا۔ کہ کیا ان پتاؤں پر بھی ہمیشہ کے لئے بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان پر کسی بھی وقت سوتیلی ماں کا پیار غالب آجانا ناممکن ہے؟

۲۱ مئی: آج میرے دونوں بچے سبھاس چندر اور شانتی سساگر مجھے ملنے آئے تھے۔ وہ میری گود میں آنے کے لیئے کس قدر بے چین ہو رہے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوا بھی ایسا نہ کر سکا۔ ڈرتا رہا۔ کہ کہیں میرا پیار ان ننھی جانوں کو مہنگا نہ پڑے (کیونکہ تپدق کے مریض کے قریب آنے والے کو اس موذی کا شکار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے) آخر کار دونوں اپنی امنگوں کو دبا کر اپنے پیار نہ کرنے والے باپ کو حیرانگی د

حسرت سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ شاید یاس نے اسیوقت کے لئے کہا تھا۔

کیا کہیں اڑ کے جا نہیں سکتے
وہ چمن ہے وہ آشیانہ ہے

۲۲ر مئی:

تپدق کا مرض اور اس کا مریض دونوں کافی دلچسپ ہیں۔ یہاں سینے ٹوریم میں کئی ہٹے کٹے اچھے بھلے نوجوان ہیں۔ چہروں پر سرخیاں دوڑ رہی ہیں۔ لیکن یہ ظاہری نقاب الٹ کر دیکھئے تو تپدق کے جراثیم ان کے پھیپھڑوں میں سوراخوں پر سوراخ کئے جا رہے ہیں۔ یہ مرض عموماً طول پکڑ جاتا ہے۔ اسی طوالت سے خوفزدہ ہو کر بارہا میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ نشتر

صیّاد قفس میں جلنا کیا یا پھیر چھری یا چھوڑ مجھے
ہے آرزوئے آرام مگر پابندی کا آرام نہیں

اس سے بھی زیادہ المناک نظارہ اُن کمسن بچوں کا ہے جو اس مرض الموت کے چنگل میں پھنسے ہوئے سینے ٹوریم کی چارپائیوں پر پھڑپھڑا رہے ہیں اگلے روز کسی مریض نے انکو مخاطب کر کے ایک کشمیری گیت کے اس شعر میں کسقدر صحیح احساسات کا اظہار کیا۔

"تو اس دنیا میں ناحق وارد ہوا۔ آخر ماں کے بطن سے تیری پیدائش میں کون سی مصلحت مضمر تھی"

۲۳ر مئی:—

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی قدرت کو بھی بیکس انسانوں کے ساتھ
مذاق کرنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے میں لطف آتا ہے۔ میرے ساتھ قدرت نے
کیا کم مذاق کیا۔ اسے چھوڑیئے، یہاں جو کمسن مریض ہیں۔ انکے ساتھ یہ سلوک
کرکے قدرت نے ان کی کھلّی نہیں اڑائی تو کیا کیا؟ آج اسیطرح کا ایک او
واقعہ پتہ چلا۔ میرے ساتھ کی جھونپڑی میں ایک نوجوان رہتا ہے۔ اسکی
ایک بچپن کی ہمجولن کے ساتھ شادی طے پائی۔ اب اس میں دیر محض
اس نوجوان کی ملازمت پکّی ہوجانے کی تھی۔ آخرکار خدا خدا کرکے اس کی
ملازمت پکّی ہونے کے احکام آئے۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شادی کی
تیاریاں شروع ہوگئیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ خوش بخت پہلے ماہ
کی تنخواہ لاتا بخار نے آدبایا۔ اور اس پر تپ دق کا مریض ہونے کا فتویٰ
صادر کردیا گیا۔

؎ قسمت پہ اس مسافرِ بیکس کی روییئے
جو تھک کے بیٹھ گیا ہو منزل کے سامنے

۲۴ر مئی:—

بینے ٹوریم کی مغموم فضا میں کبھی کبھی چند مریضوں کی بوالعجبیاں تفریح کا
سامان بھی پیدا کردیتی ہیں۔ اگلے روز ایک مریض نے ڈاکٹر پر جھوٹ موٹ
ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے سخت بخار ہے تھرمامیٹر کو بغل میں لینے کے بجائے
اپنی رضائی کے اندر رکھی ہوئی آگ کی کانگڑی (ایک طرح کی انگیٹھی) پر کچھ

دیہ رکھ کر دکھا دیا۔ تھرمامیٹر دیکھا تو ڈاکٹر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا درحقیقت پارہ ۱۱۰ ڈگری تک جا چکا تھا۔

بوالعجب ہنگامہا گرم است در بازار ما

۲۷ مئی:

آج کوئی مجھے چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا۔ میرے تصوّر کی آنکھیں اُسے دُور بہت دور کہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جب تک شام نے روشنی پر تسلط نہ جما لیا میں اس گرد سے اٹے ہوئے راستہ پر آنکھیں گاڑے بیٹھا رہا جس پہ اس کی موٹر گرد اڑاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ بار بار یہ شعر زبان پہ آتا تھا:۔ غالب

فردا و دَے کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ مجھ پہ قیامت گزر گئی

یکم جون:

یہ دنیا بھی ایک مجموعہ اضداد ہے آج سے دو روز پہلے جب کوئی مجھے چھوڑ کر کہیں بہت دور چلا گیا اور جب میں اداس اور غمگین اپنی جھونپڑی کی جانب لوٹ رہا تھا تو اچانک جنگل شہنائی کی آواز سے گونج اٹھا پڑوس کے گاؤں میں کسی کی شادی تھی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ سے کئے گئے سنگدل اس درد آمیز مذاق کو دیکھ کر کوئی شیطانی روح خوشی کے مارے ناچ اٹھی ہو۔ اس کا وہ نغمہ کسی تیز خنجر کی مانند میرے دل میں اتر کر اُسے خون خون کر گیا۔

اس حقیقت میں کتنی تلخی ہے کہ عین اسوقت جب ایک شخص اپنے محبوب کے بچھڑ جانے پر خون کے آنسو بہا رہا ہو۔ کوئی دوسرا اپنے محبوب سے ملنے کی خوشی میں شہنائیاں پھونک رہا ہوتا ہے۔

"اے خوشیاں منانے والو۔ خوشی کے موقعوں پر اسطرح جوش وخروش سے اظہار شادمانی چھوڑ دو۔ کیا جانے اس موقعہ پر کوئی مہجور تمہارے ان نغمہ ہائے شادی کی تاب نہ لاکر تڑپ اٹھے"

بہرحال مشکل تمام اس دلفگار نغمے کی زد سے اپنے تئیں بچاتا ہوا اپنی جھونپڑی میں صحیح سلامت پہنچگیا۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ اس جھونپڑی نے بھی مجھے پناہ دینے سے انکار کردیا۔ میرا کمرہ جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ادھر دل ہے۔ کہ ہاتھوں سے نکلا پڑتا ہے۔ ادھر دماغ الگ پریشان کر رہا ہے۔ بار بار یہ خیال آتا ہے کہ "کیا یہ ہماری آخری ملاقات تھی؟ کیا میرے ہمدردوں نے ایک سازش کرکے مجھے اور" اُسے "ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کردیا ہے۔ آخر ان" اپنوں "کو کیا کہوں؟ شاید ان کا خیال ہے۔ کہ مریض اس طرح اچھا ہو جائے گا۔ لیکن تپ دق کا مریض اور اچھا ہو جائے؟ نعوذ باللہ۔

یہ صحیح ہے۔ کہ گذشتہ ایک ماہ میں میری صحت خوب ترقی کر گئی ہے محض چار ہفتوں میں میرا وزن آٹھ پونڈ بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس سے کیا؟ اس خونخوار مرض کے ہتھکنڈوں سے کون واقف نہیں۔ دور کیوں جائیں اسی سینے ٹوریم میں میری آنکھوں دیکھے چند واقعات شاہد ہیں۔ کہ کئی

مریض اچھی بھلی حالت میں آئے چند ایک ماہ تک خوب تسلی بھی کی لیکن اچانک کچھ ایسا پلٹا کھایا۔ کہ خون آنا شروع ہوگیا اور خون بھی ایک ایک قے میں سیر وں۔ اور قصّہ مختصر یہ کہ آخرکار چار آدمیوں کے کندھوں پر اس سینے ٹوریم سے وداع ہوئے۔

ان مشاہدات کے پیش نظر کیا یہ صحیح نہیں۔ کہ اپنوں نے ہمدردی کی آڑ میں مجھ سے وہ کچھ کیا جو شاید بیگانے بھی نہ کر سکتے ؛ حافظ :۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

۴ر جون :۔

چند ایسے واقعات مختلف ذرائع سے پتہ چلے ہیں جنکی حقیقت میرے اس عقیدہ کو مزید پختگی بخشتی ہے۔ کہ قدرت کو بھی کبھی کبھی بے بس انسانوں سے مذاق کرنے کی سوجھتی ہے۔ ان واقعات کے پردہ میں وہ حقیقت مضمر ہے جو کسی تخیل کی صنعت سے کہیں زیادہ المناک ہے۔

ایک دیسی ریاست کے میڈیکل افسر کا واقعہ ہے کہ انکا اکلوتا لڑکا ولایت میں وکالت کا امتحان دیکر چلا آیا۔ اچانک بیمار ہو جانے کے باعث وہ نتیجہ کا انتظار نہ کر سکا۔ گھر پہنچنے پر پتہ چلا۔ کہ آنجناب علم و لیاقت کے ساتھ ساتھ ایک خطرناک قسم کی تپدق کا سرمایہ بھی لائے ہیں۔ غرضیکہ دو ہی چار ہفتوں کے بعد اُسے دنیا کے رنج و راحت سے ابدی سکون حاصل ہوگیا۔ بدنصیب باپ جسوقت اپنے گھر کے چراغ کو کسی ایک بیابان میں مردہ روحوں کی تحویل میں چھوڑ

کہ واپس گھر پہنچا۔ تو اس سُونے گھر میں ایک بجری تار اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس میں لکھا تھا۔

"آپ کا ہونہار لڑکا اول درجہ میں پاس ہؤا"۔ باپ نے اس خبر کی خوشی میں آنسو لٹا دیئے۔

ایک دوسرا واقعہ اسی جینے ٹوریم کا سنیئے۔ ایک مریض آج چار سال سے یہاں کی آہنی چارپائی پہ پڑا پھڑپھڑا رہا ہے۔ ارکانِ قضا و قدر کو خوب اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ یہ شخص جو کچھ دن کے وقت خون پسینہ ایک کرکے کماتا ہے اسی سے رات کو ایک بیوی اور دو بچوں کا پیٹ بمشکل تمام بھر پاتا ہے لیکن انہیں اس سے کیا۔ کسی کی غربت سے بے نیاز سرمایہ دار کی طرح انہوں نے بھی اس کے بستے گھر کو اپنی کھلواڑ بنا لیا۔ بیوی اپنے میکے پناہ گزین ہوئی۔ لیکن نیلے منہ والے آسمان کو یہ کب گوارا تھا ننھے ننھے بچوں کو ننہال سے بھی دھکا دے دیا گیا۔ اور اب وہ بیچاری خدا جانے کسطرح گذر کر رہی ہے۔

شاید یہ داستانِ غم ابھی تک نقطۂ عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ اسی دوران میں وہ کبھی کبھی خاوند کی تیمارداری کے لیئے یہاں بھی آتی رہی جس کا انجام ایک ننھے بچہ کی صورت میں ظاہر ہؤا۔ جس روز یہ خوشخبری ہم نے سنی تو اس شخص کو مبارکباد دینے گئے۔ اس نے خون آلود موتی لٹا کر اس مبارکباد کو قبول کیا۔ اس واقعہ کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اُس ننھے معصوم کو پیدائش سے پہلے تپ دق

وراثت میں مل چکا ہے۔ چند اور واقعات بھی ہیں لیکن قدرت کی فیاضیاں دکھانے کے لئے کیا یہ دو ناکافی ہیں۔؟

۶ر جون :۔

آج شام سیر سے لوٹے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ کسی نے کہا۔ کہ اس رستہ سے نہ جاؤ۔ کیونکہ جھاڑیاں بہت ہیں اور ان میں سانپ بکثرت موجود ہیں اپل تو اس پگڈنڈی سے منہ موڑا لیکن پھر خیال آیا کہ عجب انسان ہو۔ تپدق کے مارے ایڑیاں رگڑ رہے ہو۔ اور اسطرح کی عداوا اور فوری موت سے منہ موڑنے ہو۔ آخر اسطرح برسوں بستر پہ چھٹپٹانے سے کیا حاصل اور اگر کسی طرح بچ بھی رہے۔ تو بھی یہ ہیر کی ایک تلوار تمہارے پاؤں تلے رکھ دی جائیگی۔ اس کی تیز دھار سے گھبرا کر پاؤں پھسلا نہیں۔ کہ پھر اس خونی دریا میں غوطے کھاؤ گے۔ اس سے کیا یہ موت بدرجہا بہتر نہیں۔" چنانچہ جی کڑا کر کے اسی راہ پہ ہو لئے۔ لیکن ایک بدنصیب شخص کی اتنی خوش قسمتی کہاں کہ اُسے سانپ ڈس لے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

۱۴ر جون :۔

گزشتہ ہفتہ خوب رہا۔ آج پندرہ روز سے بخار نہیں ہوا اور ... بقول کسے "چھلانگیں لگا رہی ہے۔" تاریک خانۂ دل میں ضیاء امید کا نور بڑھتا جا رہا ہے طبیعت میں شگفتگی پاتا ہوں۔ لیکن اچانک کڑک اٹھنے والی بجلی کی مانند

اس مرض کا خیال آتے ہی سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا ہوں۔

میرے کمرہ میں کتوں کے دو ننھے ننھے پلے ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو اس تنہائی میں یہ دونوں سب سے بڑھکر میرے مونس و غمخوار ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقوق پرستی کے زمانہ میں وہ بھی اپنے حقوق پر ضرب برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں پتہ ہے کہ کھانا کھانے کے وقت مجھ سے حصّہ بانٹنا انکا پیدائشی حق ہے۔ چنانچہ اگر کسی روز تھال میں انکا حصّہ نہ چھوڑا جائے۔ تو "پروٹسٹ" کے طور پر کمرہ میں اودھم مچا دیتے ہیں۔ شام کا وقت ہو۔ تو "آساوری" گانے لگ جاتے ہیں۔ صبح ہو تو "شام کلیان" انہیں بہتیرا سمجھاتا ہوں۔ کہ میاں راگ ہی گانا ہے۔ تو وقت کے مطابق گاؤ۔ لیکن انکے تان پلٹوں میں میری آواز کون سنتا ہے۔ حتیٰ کہ مجبور ہو کر اپنے "ربڑ و ڈنڈ" سے انہیں ڈبل روٹی دینا ہی پڑتی ہے۔ جب کہیں یہ ستیہ آگرہی مانتے ہیں۔

۱۶ر جون:

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بندق مجھے شاعر بنا کے چھوڑیگا۔ یہ ایک ایسی المناک چوٹ ثابت ہوا ہے۔ جو ایک شریف انسان کو شاعر بنا دیتی ہے یا یہاں کی فضا ہی شعر خیز ہے۔ جسطرف بھی نکل جاؤ چشمے۔ آبشاریں۔ اور قدرت کا وہ حسین نکھرا۔ جو غازہ طرازی کا مرہون نہیں۔ جنگل سے باہر نکلو۔ تو میلوں لمبی گھاٹیوں میں بچھے ہوئے کھیتوں کی ہریاول اور پھر اُن میں کام کرنے والی وہ حسین اور نوجوان عورتیں۔ جو بلاشبہ مصوّرِ قدرت کی شاہکار ہوتی ہیں۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ انکے حسن پر حجاب کا ہلکا سا پردہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ حسین جو اپنے

حسن کو نہیں پہچانتے آپ کو دیکھ کر بھی بے حجابانہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں
ٹوٹی پھوٹی کشمیری زبان میں آپ کے سوالوں کا جواب جب ہنسکر دیا جائے۔ تو کیوں
نہ آپ شاعر بنجائیں۔ اور پھر جب آپ انکے نہ سمجھنے والے گیتوں کا نغمہ سنیں جو کسی
حسین کے لبوں کو چھو آنے کی خوشی سے پاگل ہو کر چاروں طرف پہاڑوں سے
ٹکرا ٹکرا کر آپ کو بھی پاگل بنادے۔ تو آپ شاعر نہ بنیں۔ تو اور کیا ہو۔ غرضیکہ
اس ماہ میں نے تین غزلیں کہہ ڈالیں۔ شاید یہ میرا پہلا موقعہ ہے کہ میں نے
کوئی غزل مکمل کی ہو۔

خدا جانے مجھپر دل کو کس نے کہہ دیا کہ میں شاعر ہوں۔ان میں نہ صرف
چند شاعر نواز ہیں۔ بلکہ کچھ ایک شاعر بھی ہیں۔ یہی نوجوان شاعرات کو جب
مشاعرہ شروع کرتے ہیں۔ تو کیا کہوں۔ کہ کیا کیفیت ہوتی ہے اور شاعر نوازوں
کی نوازش تو عرب کا وہ زمانہ میری آنکھوں کے سامنے لا دیتی ہے جب رات
رات بھر کسی شاعر مہمان کی خدمت کی جایا کرتی تھی۔

۲۰ جون :

میرے چار سالہ لڑکے سبھاش۔ نے اپنا انگوٹھا لگا کر مجھے چٹھی لکھی ہے کہ "میں
سکول میں داخل ہو گیا ہوں"۔ میں نے اُسے جواب میں لکھ بھیجا ہے۔ "کہ بھگوان
سے میری یہی پرارتھنا ہے۔ کہ بدقسمتی سے تمہارا باپ جس علم کی تکمیل نہ کرسکا۔ تم
اس کی انتہا کر دو"۔

شاید یہی قدرت کا قانون ہے۔ کہ جب انسان خود کسی کام سے عاجز آجاتا
ہے۔ تو اسکی نگاہیں اپنی اولاد میں سے کسی ہستی کو ڈھونڈتی ہیں۔ جو اسکی سپرٹ لے کر

اس کام کی تکمیل کر سکے۔ جبھی کہا گیا ہے۔ کہ ؏

پدر اگر نتواند پسر تمام کند

۲۱ر جون:

میں نے کئی سال کے بعد اچانک گوشت خوری شروع کر دی ہے۔ اس بیماری کے آغاز میں ڈاکٹر کے کہنے کے باوجود میں نے مچھلی کا تیل اور گوشت استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ گذشتہ چار ہفتوں سے میرے والد امجد مختلف دلائل سے مجھے گوشت خوری پر قائل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ میرا جواب یہی تھا۔ کہ مجھے اس سخت ترین امتحان میں پورا اترنے دیجئے۔ زندگی کی محبت کے جال میں پھنسا کر مجھے اپنا اصول ترک کرنے کو نہ کہئے۔ لیکن آخر انکے سینہ میں ایک باپ کا دل تھا۔ جس کے لئے نوجوان بیٹے کا اسطرح موت کے بستر پر دراز ہو جانا اسقدر سخت چوٹ ہے۔ کہ وہ دماغ سن کر دیتی ہے۔ ایک ایسا طوفان ہے جو اپنی رو میں ہر اصول کو بہائے جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے "حکم" دیا کہ "تمہیں کھانا ہی ہوگا"۔ شاید کوئی اور موقعہ ہوتا۔ تو میں یہ حکم ٹال بھی دیتا۔ لیکن اس خیال نے کہ "شاید یہ آخری حکم ہو جس کی فرمانبرداری مجھ ایسے نالائق کے ہاتھوں انجام پائے"۔ مجھ میں یہ ہمت نہ چھوڑی۔ کہ اس ہستی کا حکم جو دنیا بھر میں میرے لئے سب سے زیادہ قابلِ احترام ہے۔ یوں رد کر دوں۔ کہ میری یاد کے ساتھ ہی یہ تلخ حقیقت اُسے اور زیادہ رنجیدہ کر دیا کرے۔ چنانچہ میں نے جو اصول اپنی زندگی کی خاطر نہ چھوڑا۔ وہ ایک پیار بھرے دل کے جذبات کے احترام میں ترک کر دیا۔

۲۲ ر جون :۔۔۔۔۔۔

گویا میری شاعری مسلّم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک مریض ہے جو پہلے روز ہی سے مجھے اپنی دانست میں شاعر سمجھ رہا ہے۔ اور کئی بار مجھ سے اپنا کلام سنانے کا تقاضا کر چکا ہے۔ میں اپنے "ابجد تک سے ناواقف" سامعین کی شاعر نوازی کا عالم کیا بیان کروں۔ اب تو اسکی شاعر نوازی اس حد تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اگلے روز وہ ایک خط لایا۔ کہ "یہ میں اپنے والدین کو بھیج رہا ہوں۔ وہ میرے متعلق بہت پریشان ہیں۔ اس لئے آپ چند خوب بڑے بڑے شعر (جنہیں وہ بیت کہتا ہے) اس پر ان کی تسلّی کے لئے لکھ دیں"۔ میں حیران تھا یا اللہ یہ پڑ گئی اور مصیبت کیسی۔ پہلے تو میں نے سوچا۔ کہ غالب کا یہ شعر لکھ دوں۔ ؏

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہؤا

اور یقین جانیے۔ کہ میں یہ لکھ دیتا۔ تو بھی وہ عاشقِ شعر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ بہرحال میں نے اسی شعر پر اکتفا کی۔ ؏

جو خدا بے جان کو دیتا ہے جان
اسکی رحمت پر بھروسہ چاہیئے

بایں ہمہ یہ گلہ باقی رہ گیا۔ کہ کوئی خوب بڑا سا شعر تو لکھا ہی نہیں۔

۲۴ ر جون :۔۔۔۔۔۔

آج وہ مسئلہ درپیش ہے۔ جو ایک مدت سے میرے دماغ میں ہے۔ لیکن

"کوشش بسیار" کے باوجود ہیں آجتک اس کا حل نہیں پا سکا۔

اس سینے ٹوریم میں زنانہ مریض بھی ہیں۔ اور دونوں جنسوں کے بہت سے افراد کی یکجائی کا جو انجام ہوا کرتا ہے۔ وہ یہاں بھی ظاہر ہے یعنی یہاں بھی آنکھیں لڑ جاتی ہیں۔ یہاں بھی زلفیں اپنے جال میں طائر دل کو پھنسا لیتی ہیں۔ یہاں بھی حسن پر عشق مچلتا ہے۔ بلا شبہ عشق کا دیوتا اندھا ہے۔ جسے یہ علم نہیں کہ اس سینے ٹوریم میں دق کے جراثیم چاروں فضاؤں میں محیط ہیں۔ اور کہ اس میں داخل ہونے والا بھی انکے حملہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس اندھے کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ وہ پھولوں کی کمان لئے بارہا یہاں بھی آتا ہے۔ غالب کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہ سب کچھ صحیح۔ لیکن کیا یہ حیرت کا مقام نہیں۔ کہ موت کے بستر پہ دراز انسان بھی اس سے باز نہیں رہ سکتا۔ اور پھر جب یہ واضح ہو۔ کہ اگر اس مرض سے بچ نکلنے کی کوئی امید ہو بھی۔ تو ایک مرتبہ کا جنسی تعلق ہمیشہ کے لئے اس امید کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ لیکن مریض ہیں۔ کہ عشق کے کچے دھاگے سے بندھے ہوئے ایک دوسرے کی جانب راجع ہیں۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟ کیا راز ہے؟ یہی مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور یہ حادثہ میں نے ان پر بھی گھٹتے دیکھا ہے۔ جو پیشتر از یں "کسی" سے عشق کا دم بھرتے ہیں۔ بایں ہمہ کسی حسین کو دیکھکر انکا دل بھی ایک کشش سی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس راہ چلتے

حسین سے کیا چاہتے ہیں؟ اور کس حد تک چاہتے ہیں۔ اسکا تعین ایک ناقابل حل مسئلہ ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان کی چاہ غالباً یہیں تک محدود ہوتی ہے۔ کہ وہ اُن سے ہنس لو لے۔ وہ انہیں بھی "اپنا" سمجھکر حجاب کی تکلفداریاں اٹھا دے۔ بس اتنا ہی۔ یہی جذبہ آخر ہے کیا شئے کیا یہ گناہ ہے؟ اگر ہاں۔ تو پھر انسان اس بارے میں بے بس کیوں ہے؟ تو کیا یہ عین قدرتی ہے۔ تو پھر اسکو بُرا کیوں کہتے ہیں؟ کیا کوئی دانائے راز کمال مہربانی کے جذبہ سے مجھ ناچیز کو اسکی حقیقت اور وجہ پیدائش سے آگاہ کرنے کی تکلیف گوارا کرے گا۔ تاکہ اس "شاید آخری" وقت میں میرے دل کی ہلچل نشانت ہو جائے۔

۲۵ر جون :

گذشتہ ماہ کی ڈائری پڑھ کر جن دوستوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان میں سے جناب طائر کی رائے قابل غور ہے۔ آپ بھی آغاز میں دوسروں کی طرح کانٹوں پر گھسیٹنے والی باتیں لکھی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔

"مجھے ایسا خیال آتا ہے۔ کہ جس شخص کو پہلے پہل سینے ٹوریم بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ علم نفسیات سے بالکل بے بہرہ تھا۔ سینے ٹوریم کی رہائش قلبی سکون کا باعث نہیں ہو سکتی۔

ایسی پرہول وادی میں جہاں بیمار دل کے دماغ پر ہر وقت موت کی وحشت تسلط رہتی ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے مریضوں کے اداس چہرے نظر آتے ہوں اور جس جگہ کے مکینوں کے دل پر ہر وقت یہی خوف طاری رہتا ہو۔ کہ موت کا خونی عقاب جو ہر وقت اس اداس وادی پر پر پھیلائے رہتا ہے نہ جانے

کب کسی کے طائر روح پر جھپٹا مارے۔ کبھی صحتیابی کی امید ہو سکتی ہے؟

تمہارے اس شاہکار کے لفظ لفظ سے مایوسی اور سوز ٹپکا پڑتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان تمہارے احباب کے لئے تیر نیم کش سے کم نہیں۔ تم نے کیا یہ بھی سوچا کہ پڑھنے والے تمہارے دوستوں کے دل پر ان الفاظ نے کتنے چرکے لگائے ہونگے خدا کے لئے اس پرسوز اور المیہ نثر نگاری کو چندے ملتوی رکھو"

ایک حقیقی دوست کے جذبات کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ خط اس کا مرقع ہے لیکن رات کو رات نہ کہنے سے اس کی اندھیاری میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ تو پھر تپدق کے لازمی انجام سے انکار کے کیا معنی۔ دق میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ کی روح کے خلاف کسی ملک الموت نے ڈگری جاری کر دی ہے۔ اب یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ آپ عدالت کے اس چپڑاسی کیطرح جو ڈگری اجرا کرنے کا پروانہ لے کر آتا ہے۔ اس ڈگری دار کو بھی مسلسل و پیہم رشوتوں سے چند سالوں کے لئے اس کا اجراء رکوالیں۔ لیکن آخر کار وہ ہو کر ہی رہے گا۔ پھر اس سے خوف کیوں؟

ع نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

۲ر جولائی

آج ڈسپنسری میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں چیتھڑوں میں ملبوس چند دیہاتی بیٹھے تھے۔ کسی مریض کو لائے تھے۔ جو قریب ہی چارپائی پہ پڑا ہوا تھا۔

اُس نے اپنے ایک ساتھی سے ہماری جانب اشارہ کر کے کچھ پوچھا ساتھی نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ البتہ اُس نحیف و زار مریض نے اسکے بعد کچھ ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ جن میں نفرت نمایاں تھی۔ البتہ اس نفرت کے کناروں پر کہیں کہیں رحم کی رنگت بھی جھلک رہی تھی۔

وائے یہ تپدق۔ کہ وہی آنکھیں اگر ہمیں اس ہسپتال سے باہر دیکھتیں تو ایک خوش پوش نوجوان کے سامنے شاید زمین سے اوپر نہ اٹھ سکتیں۔ لیکن آج وہ ہماری پوشاک میں نہ اٹک کر ہمارے پھیپھڑوں تک پہنچ گئی ہیں۔ اور ہم ان رحم آمیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر اُس مریض کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔

لوٹتے وقت رزّاق شیخ کہنے لگا "یہ جو ہمیں اسطرح گھور رہا تھا۔ اگر پانچ ہی منٹ کے بعد اسے بھی ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ تمہیں تو تپدق ہے اپھر......!"

ہم سب ہنس پڑے جیسے اس ایک بات ہی سے ہم اپنی کمتری کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے۔

انسانی ذہنیت.......! انسان خود گرتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ گرا کر تسکین پانے کی سعی کرتا ہے۔

کئی مرتبہ میں نے دیکھا ہے۔ کہ مریض اکٹھے بیٹھے ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں "دیکھو وہ فلاں درخت بالکل سوکھ گیا ہے۔ اسکے پتے بھی پیلے پڑ گئے ہیں یقیناً اسے بھی دق ہو چکا ہے۔ وہ پرلا پیڑ ابھی آدھا ہرا ہے۔ اسکا دق ابھی پہلے مرحلہ پر ہے وغیرہ وغیرہ" اور مجھے ان باتوں کی تہ میں بھی انسان کی وہی ذہنیت نظر

آتی ہے۔ جو دوسروں کو اپنے جیسا دیکھ کر سکون پاتی ہے۔

۶ر جولائی:

ایک نیا ڈو گرہ مریض میرے ساتھ والے کمرہ میں آیا ہے۔ کسی سرکاری دفتر کا کلرک ہے لیکن اسقدر نرم دل کہ بات بات پہ رو دیتا ہے۔ بیوی کا خط آیا تو رو دیا۔ کھانا کھانے لگا تو بیوی کے ہاتھوں کا بنا کھانا یاد آیا اور رو دیا۔ رات کو سونے لگا۔ تو کوئی یاد آگیا اور رو دیا۔ ڈاکٹر نے آکر حال پوچھا۔ تو رو دیا کسی نے پوچھا "کتنے بچے ہیں۔ آپکے"۔ تو رو دیا۔ صبح آئینہ میں اپنا منہ دیکھا تو رو دیا غرضیکہ رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کئے جا رہا ہے۔ میں آج اُس کی ڈھارس بندھانے کی غرض سے ایک دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بار بار اپنے بچوں اور بیوی کا تذکرہ کچھ اس پیرائے میں کرتا رہا کہ خود مجھے رلائی آئی جاتی تھی۔ بہرحال بمشکل تمام اُسکی بہت کچھ ڈھارس بندھا آیا ہوں۔

اس کی ڈھارس تو بندھا آیا ہوں لیکن اس اپنے دل کو کیا کروں جو اسوقت سے خود اپنا چین کھو بیٹھا ہے۔ اور ہر لحظہ یہ بے چینی اور بے کلی بڑھتی جا رہی ہے، ڈرتا ہوں کہیں مجھے بھی رونا نہ پڑ جائے۔

۷ر جولائی:

صبح سے طبیعت میں ایک اضمحلال سا موجود ہے۔ کل کا اثر ابھی تک باقی ہے حتیٰ کہ شام چھ بجے کے قریب ہلکی سی حرارت محسوس ہونے لگی۔

۹ر جولائی:

شام کے وقت حرارت باقاعدہ ہو گئی ہے۔ کئی ہفتوں سے جو طبیعت کچھ

سنبھلی ہوئی تھی اسکو پھر ایک دھچکا سا لگا ہے۔ جس موت کو کسی حد تک بھول گیا تھا۔ اُس کی ایک واضح اور معین شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے پھر وہی پرانی باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ انہی دنوں وہ غزل کہی ہے۔ جس کے مطلع کا مصرعہ ہے۔ ؏

پھر وہی میں ہوں وہی صحرا وہی بربادیاں

۱۴ر جولائی:۔

شام چھ بجے کا بخار گویا مستقل ہو گیا ہے۔ چار بجتے نہیں۔ کہ چھ بجے آنے والا بخار ایک وہم کی صورت میں میرے دماغ پر تسلط جمانا شروع کر دیتا ہے۔ چار پائی سے حرکت تک کرنا بند کر دیتا ہوں۔ ہزار احتیاطیں کرتا ہوں کہ اسوقت حرارت نہ ہو جائے۔ فیض۔ خیراتی لال۔ شمبھو ناتھ۔ گوپال داس سب کے سب میرے کمرہ میں آ کر دلچسپ دلچسپ موضوع چھیڑتے ہیں۔ تاکہ میرا دھیان بٹ جائے۔ لیکن بخار کا بھوت ہے۔ کہ میرے سر سے کسی طور نہیں اترتا۔ ان رسیلی باتوں اور گوپال داس کی میٹھی تانوں کے باوجود ایک لمحہ کے لئے میں اس خیال کو دماغ سے باہر نہیں کر سکتا۔ کہ" چھ بجے بخار آئیگا"۔ حتیٰ کہ چھ بجے تھرمامیٹر لگاتا ہوں اور بخار موجود ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ کہ یہ حرارت تمہارے وہم کی تخلیق ہے۔ اور میں بھی مانتا ہوں۔ لیکن یہ وہم۔ یہ کسطرح دُور ہو۔ ایک "دق یافتہ" مریض کے لئے تو شائد یہ ناممکن ہے۔

۱۷ر جولائی:۔

بخار بھی ٹوٹا اور طلسم وہم بھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ میرا تھرمامیٹر

ٹوٹ گیا نئے تھرمامیٹر کے لئے شہر میں لکھ بھیجا۔ جو تین روز میں آیا۔ اور جتنے دن وہ آیا نہیں چونکہ تھرمامیٹر لگانا نہیں ہوتا تھا۔ اسلئے شام کی احتیاطی تدابیر سے لاپرواہی برتی گئی۔ گویا خارجی طور پہ وہم کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے جسکا انجام یہ ہؤا۔ کہ آج جب شام کو درجۂ حرارت دیکھا۔ تو بالکل نارمل تھا۔ گویا اتنے دن مجھے بخار نہیں وہم تھا۔

وائے بر حالِ ما مریضاں

۱۸ ر جولائی:

گزشتہ دنوں جب مجھے بخار آجاتا رہا۔ تو ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تمام دن بستر پر (جسے موت کا بستر کہنا زیادہ موزوں ہے) لیٹے لیٹے انسان کی دلی کیفیت نہایت مایوس کن ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اسوقت جب مجھ جیسا شاعر مزاج اپنی کھڑکی میں سے بادلوں کے کاروان کسی نامعلوم منزل کی جانب جاتے ہوئے دیکھے۔ جب وہ دیکھے کہ کئی رند قسم کے بادل گلمن مرگ کی سفید چوٹیوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ جب وہ مے نوش مستی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا جاتے ہیں۔ اور سینے ٹوربم کی گھاٹیوں میں کھڑے سرو و صنوبر یہ نظارے دیکھ کر نہ صرف جھوم جھوم جاتے ہیں۔ بلکہ اسی بہانہ کوئی تن آور کسی سرو قد کے گلے میں باہیں ڈال لیتا ہے۔ جب وہ مریض ان نظاروں کو دیکھکر دیوانہ وار ان وادیوں میں اِدھر سے اُدھر بھاگنا چاہتا ہے۔ گیت گانا چاہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کا حکم اُسے چارپائی سے بندھا رہنے پر مجبور کرے۔ تو نہ پوچھیئے۔ کہ دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ یا تو ان بندھنوں سے آزاد ہوں۔ اور اگر

مدقوق مریض کے لئے چھٹکارا ممکن نہ ہو۔ تو مرجانا بہتر ہے۔ اور وہ بھی بہت جلد یہ بھی ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ جب مرجانے کا یقین تو ہو۔ لیکن موت آتی نہ ہو۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں محبوس شخص کو یہ تو ڈھارس ہوتی ہے۔ کہ "چلو فلاں روز ان مصائب کا خاتمہ ہوجائے گا"۔ لیکن ہم تو اس سے بھی بدتر ہیں۔ موت کی وادی میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ "تیر نیم کش" چھوڑنے والے شکاری موجود ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں۔ کہ اس کا کونسا تیر جان لیوا ہوگا۔ ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی — غالب

۲۰ر جولائی :

مئی اور جون کی ڈائری پڑھ کر کئی دوستوں کے خطوط پے در پے موصول ہورہے ہیں۔ ایک عزیز دوست کی بیوی نے جنہیں مجھ سے بہت ہمدردی ہے ایک ہی سطر میں اُن تمام لمبے چوڑے خطوں کے مضامین کو بند کردیا ہے۔ لکھتی ہیں "آپ کی ڈائری کے ایک ایک لفظ سے یاس وحسرت ٹپکتا ہے۔ لیکن وہ دن کہاں گئے۔ جب آپ ہم سب سے بڑے آشاوادی کہلاتے تھے۔ جب بڑی سے بڑی آفت کے وقت بھی اُس کھلے ہوئے چہرہ سے مسکراہٹ جدا نہ ہوتی۔ تو آج ایسا کیوں ——؟

اگر اس ایک خط کا جواب دیدوں۔ تو سمجھئے دیگر تمام دوستوں کو میرا جواب پہنچ گیا۔ اور ان محترمہ کو ان دو مصرعوں کے سوا اور جواب بھی کیا دے سکتا ہوں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار "تپدق" ہمیں رلائے کیوں

۱۶ راگست:۔

ایک ماہ ڈائری خاموش رہی ہے۔ آخر ہر روز نئی باتیں لکھنے کے لئے کہاں سے آجائیں۔ یہاں کے روزمرّہ کے معمول سے مانوس سا ہوگیا ہوں۔ کچھ طبیعتیں سنبھل رہی ہیں۔ کچھ مرنے کے لئے گھر چلے جاتے ہیں۔ جو نئے آتے ہیں۔ انکے چہروں پر وہی افسردگی اور ملال جو تازہ واردان وادی دق پر طاری ہوتا ہے۔ انمیں میرے لئے کوئی نئی بات نہیں رہ گئی۔ میں نے یہ جگہ کچھ اسطرح اپنالی ہے گویا ہمیشہ سے میرا یہی گھر تھا۔ سچ ہے "دلی زخموں پر بہترین پھاہا وقت ہی رکھتا ہے"۔ کبھی کبھی کوئی خاص واقعہ سن لیتا ہوں۔ تو جذبات میں تھوڑا بہت ہیجان واقع ہوجاتا ہے۔ جیسے اپنے ایک نئے دوست کا واقعہ ابھی کل ہی سنا ہے۔ اسے جب سینے ٹوریم میں آنا تھا۔ تو وہ بھائی کے ساتھ بازار سے نیا بوٹ لینے گیا۔ قدرتی تھا کہ وہ لوگ سوداگر نے وقت بوٹ کی مضبوطی خوبصورتی وغیرہ کا اندازہ کررہے تھے۔ لیکن اسکا بیان ہے کہ مجھے ان کی تحقیقاتوں سے چڑ آرہی تھی اور سوچ رہا تھا۔ کہ کوئی معمولی سا بوٹ لے لیا جائے جو چار پانچ ماہ کا گذارہ کردے اس کے بعد کس نے رہنا ہے۔ اور کون اسے پہنے گا!"

یہ ایک بات انسان کی ذہنی کیفیت کو کتنا اجاگر کررہی ہے۔ بہرحال ایسی ہی کوئی بات سن لوں تو طبیعت پر اثر ہوتا ہے۔ ورنہ طبیعت بہت ہلکی رہتی ہے

مزاح کا پرانا عنصر بہت سے غالب ہے۔

سوچتا ہوں۔ کہ اللہ میاں میں بھی مزاح کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہے۔ ایک نمونہ یہیں دیکھئے۔ ہمارے ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر چھوٹے ڈاکٹر سے قد میں ڈیڑھ بالشت چھوٹا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ بڑا کسے کہیں اور چھوٹا کسے۔

۱۵ر ستمبر

تپ دق کے مرض کی ایک دلچسپ تشبیہ سوجھی ہے۔ کیا یہ اور مرض عشق ایک دوسرے سے ہر طور مشابہ نہیں۔ مریضِ عشق کا کلیجہ بھی زخموں سے چھلنی ہو چکا ہوتا ہے جیسا کہ ذوق نے کہا ہے۔

دل نے زخموں کی ترقی سے عجب پائی بہار
پہلے تھا صد برگ یہ گل اب ہزارہ ہو گیا

اور مریضِ دق کو بھی عین اسی جگہ (پھیپھڑوں میں) زخم ہو جاتے ہیں۔

مریضِ عشق بھی ہولے ہولے سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے اور یہی عالم مریضِ دق کا ہے وہ بھی جھر جھر کر مرتا ہے۔ اور یہ بھی۔ وہ بھی ایک لاعلاج مرض ہے اور اسکا بھی آج تک کوئی واضح علاج نہیں ڈھونڈا جا سکا۔

ان تمام باتوں کو سوچتے سوچتے بارہا مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ ہم لوگ مرضِ دق میں مبتلا ہیں یا مرض عشق میں۔

مرضِ عشق کا ذکر چھڑا ہے۔ تو اسکی نفسیات کے متعلق بھی کچھ سنئے۔ مجھ سے چار پانچ ماہ ہوئے۔ یہ سوال پوچھا تھا۔ کہ "یہاں موت کے بستروں پر پڑے پڑے بھی آنکھیں کیوں لڑ جاتی ہیں۔ اس جنسی کشش کا کیا باعث ہے" اس کا

جواب مشہور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی نے دیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "یہ جنسی کشش جسے بعد ازاں لوگوں نے محبت اور عشق کا نام دے دیا۔ ایک قدرتی حقیقت ہے۔ جو روز ازل سے ہر اس موقعہ کو تلاش کرتی رہتی ہے جب وہ اپنے تئیں ثابت کر سکے۔ قدرت نے اسکو وحدت و کثرت کے بندھنوں میں نہیں الجھایا تھا۔ یہ تو ہماری مختلف مجلسوں نے اپنے اپنے تنگ نظر لوں میں انہیں جکڑ لیا اور جہاں بھی یہ مجلسی بندھن ذرا بھی ڈھیلے ہو جاتے ہیں یہ اپنی طاقت دکھاتی ہے۔ یہ نہ ہوں جب بھی یہ اپنے وجود کو پیش کرنے میں کوشاں رہتی ہے ــــــــــ"

اور یہی حقیقت بھی ہے۔ ہم لوگ ایک حقیقت کو ڈھونگ کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا۔ جو حسن کو دیکھکر بیتاب نہ ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ ڈھونگ کر کے اس جذبہ کو غیر قدرتی طریقوں سے دبایا جائے۔ ورنہ کیوں جائیے۔ اپنی عبادتگاہوں کو دیکھئے۔ جہاں ہم لوگ پوجا پاٹھ کا ڈھونگ رچائے ہوتے ہیں۔ وہاں بھی میں نے آنکھیں لڑتی دیکھی ہیں۔ بہت قریبی رشتہ داروں میں یہ حقیقت نمایاں دیکھی ہے۔ اور پھر یہ کشش کسی کو اپنی عمر موزونیت کا احساس تک نہیں ہونے دیتی۔ ایسے ہی ایک سینے ٹوریم کے رسوئیے کا ذکر ہے۔ جس پر یہ مثال صادق آتی تھی۔ "آنکھوں سوجھے نہ اور نام نین سکھ"۔ آپنے ایک مریضہ کے نام جو ایم۔ اے کی طالب علم تھی۔ ایک رقعہ لکھا۔ جس میں یہ شعر لکھا تھا۔ ع

نہیں برق تپاں ہرگز مشابہ قلب مضطر سے

یہ تڑپے ہر گھڑی ہر دم وہ تڑپے جبکہ بلبلہ پہ سے

یہ تو بے چارہ باورچی رہا۔ میں نے دوسرے کئی ہسپتالوں میں ان بڑے بڑے ڈاکٹروں کو۔ جو دوسروں کو تپدق کے مریض سے دس دس فٹ دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کسی کسی حسین مریضہ کے بستر پر گھنٹوں بیٹھے میٹھی میٹھی باتیں کرتے دیکھا ہے۔ حالانکہ ان سے میٹھی بات کی توقع سورج سے سائے کی تمنا کے برابر ہے۔

یہیں وہ بھورا سا کتا بھی ہے۔ جسے ہمارا جھوٹا کھانا کھا کر دق ہو چکا ہے۔ وہ ہر روز سوکھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی میں نے اُسے اپنی روٹی اُس مشکی کتیا کو کھلاتے دیکھا ہے۔ جس کے گرمانے کا ان دنوں موسم ہے۔ اس قدر مستند مشاہدات کے باوجود اس بات سے حیران ہونا کہ موت کے سایہ میں بھی کیوں یہاں محبت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ یقیناً نادانی ہے۔ اس دنیا کی حقیقت ہی ایسی ہے یہ تو خیر دق کا ہسپتال ہے۔ تو لوگوں کا اسطرح ہنسنا گانا تعجب کا باعث ہے۔ ورنہ اگر وسیع نظری سے دیکھا جائے۔ تو کیا ہسپتال سے باہر تمام لوگوں کو اپنی لمبی زندگی کا اعتبار ہے۔ کون ہے جو کسی بھی وقت موت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی لوگ بڑے بڑے محل اور قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ جیسے انہیں ہزاروں سال زندہ رہنا ہے۔ ع

سامان سو برس کا کل کی خبر نہیں

۱۰ اکتوبر

مہینوں گذر گئے ہیں۔ ہر روز کی ایک ہی طرح کی زندگی سے اُوب گیا ہوں

کوئی نئی چیز لکھنے والی نہیں۔ البتہ بیٹھا بیٹھا مختلف لوگوں کے قلمی خاکے بنایا کرتا ہوں
نمونہ دیکھئے اپنے ڈاکٹر پر طبع آزمائی کی ہے۔ آخر وہ ہر روز ہم پر دوائیں آزماتے ہیں
ہم نے اُن پر طبع آزمائی تو کیا ہُوا۔

اُن کی سب سے بڑی خصوصیت انکی آواز ہے۔ جسے اگر کسی چیز سے تشبیہہ دی
جا سکتی ہے۔ تو وہ نقرئی گھنٹیوں کی آواز سے۔ یہانتک کہ اگر انہیں پردہ کے
پیچھے سے بولنے کے لئے کہیں تو انکی تانیث و تذکیر میں تمیز نہ کر سکیں۔ اور یوں
بھی ننھے مُنّے اور نازک نازک اعضاء و جوارح میں نسائیت کا پہلو زیادہ ہے۔ رنگ
خوب چِٹّا ہے۔ باریک تر چھا سا قد مگر اوسط سے کچھ کم جیسے کوئی ننھا سا سرو
کا بوٹا ہو۔ عینک کے تال اس چھوٹے سے منہ کیلئے بہت بڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے۔ کہ کوئی بچہ اپنے باپ کی عینک لگائے پھرتا ہے۔ بایں ہمہ عینک نے حسن میں
اضافہ کر رکھا ہے۔ اسیطرح ادھ کٹی مونچھوں نے بھی جنکا فیشن لارڈ کرزن نے
شاید انہی کے پیش نظر نکالا تھا۔ لیکن ایسے سندر مکھڑے کو بھی انہوں نے کبھی نہ ہنسنے
کا عیب لگا رکھا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں غیر معمولی لیاقت کے باعث چھوٹی
سی عمر میں ایک بہت بڑا عہدہ مل گیا ہے۔ اب انکے پاس اپنے ماتحت بوڑھوں
پر رعب رکھنے کے لئے بارعب خاموشی کے سوا کوئی طریقہ نہیں۔ اور اسی وجہ سے انکی
بذلہ سنجی اور ادب دانی اس بے کیف اور مجبوری کی خاموشی کی موٹی تہ کے نیچے
گھٹ گھٹ کر دم توڑ رہی ہیں۔ بہر حال ہسپتال میں نہایت سختی سے راج کرنے
کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ مجھ ایسے جرنلسٹ مریض سے بھی انہوں نے کبھی دلچسپی سے
بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خود بڑے بڑے شہروں کے ترقی پسند کالجوں

میں لڑکیوں کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ اور یوں بھی رومانی اور شاعرانہ طبیعت
کے مالک نظر آتے ہیں۔ لیکن ہسپتال میں اس سلسلہ میں نہایت سخت گیرانہ
پالیسی کے حامی ہیں۔

شاید انکی ظاہری تُرش مزاجی کا ردِّ عمل ہے کہ صبح جب مریض کے پاس آ
کر نقرئی گھنٹیوں جیسی آواز میں پوچھتے ہیں۔ کہ "سناؤ مسٹر —— کیا حال ہے
——" تو بدحال مریض بھی ایک بار تو اپنے تئیں خوشحال محسوس کرتا ہے۔ اور آپ
رحمت کا مجسم فرشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب لاؤڈ سپیکر سے گانے کی پوری
آواز نہ سنائی دے رہی ہو۔ اور مریض کسی چپڑاسی سے ریڈیو کی ٹون اونچی کرنے
کو کہیں۔ اور یہ جواب ملے۔ کہ "ڈاکٹر صاحب دفتر میں کام کر رہے ہیں۔ اونچا نہیں ہو
سکتا"۔ تو مریض تصور ہی تصور میں آپ کو مایوسی کا دیو سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جس کے
لمبے لمبے اور ڈراؤنے دانت ریڈیو کے پیٹ میں کھب گئے ہیں۔ اور پھر یوں محسوس
ہونے لگتا ہے۔ جیسے ریڈیو گا نہیں رہا۔ بلکہ درد کے مارے دھیمی دھیمی آواز
میں کراہ رہا ہے۔ کاندھے پر کوٹ لٹکا کر دفتر سے گھر جاتے وقت آپ پر وہ عالم
ہوتا ہے۔ جیسے پہلی جماعت کے بچے چھٹی ہونے پر گھر جا رہے ہوں۔ البتہ چال کا یہ
عالم ہے۔ کہ سیر کو بھی جاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کسی ضروری کام
سے جا رہے ہیں۔ یا شاید انہیں گھر کی سرکار سے چھٹی ہی تھوڑی ملتی ہے۔ البتہ ایک
کام میں عجلت کرتے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ اور وہ ہے مرض کی تشخیص۔ آپ
انہیں ذرہ بھر تکلیف بیان کیجئے۔ گھنٹوں آپ کا معائنہ کرتے رہیں گے۔
اور یہی باعث ہے۔ کہ آپ جس روز نہ ہوں۔ ایک بھی مریض کی تسلی نہیں ہوتی

واللہ اعلم بالصواب ۔

۱۴ اکتوبر:۔

صحت قریب قریب ٹھیک ہو چکی ہے سردی کا زور ہو جانے کے باعث تمام ساتھی جا چکے ہیں۔ آدھی رات کے قریب ایک امیر ہمسائی نے نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ کہ "کل صبح موٹر آ جائے گی۔ اور کوچ ہو گا" مجھے اتنا تک نہیں پوچھا۔ کیا آپ بھی چلیں گے"؟

ہاں۔ جاتے وقت کون کسی کا مینت۔

اس سینے ٹوریم کی برسی ہوئی بدلی ہیں ابھی کئی بجلیاں موجود ہیں جو چشم زدن ہیں میرے خرمنِ سکون کو خاک کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ سریندر سنگھ ایک تیسرے درجہ پر پہنچا ہوا مریض ہے۔ ایک روز بھی وہ چارپائی سے اٹھکر برآمدہ تک نہیں آیا۔ آج چار سال سے چارپائی کے ساتھ چارپائی ہو چکا ہے۔ لیکن واہ رے شیر دل۔ میں نے ہمیشہ اُسے ہنستے ہی دیکھا ہے۔ جب جاؤ آپکا دامن ہنسی کے پھولوں سے بھر دے گا۔

لیکن ...... آخر وہ انسانیت سے بالا نہ ہو سکا۔ آج وہ پھوٹا اور اسطرح کہ ایک بار تو اسکا تمام بستر بھیگ گیا مشہور جرمن فلاسفر نٹشے کیطرح جب وہ ہنسنے پر آگیا۔ تو کئی ایک کو رُلا کر بھی چپ نہ ہو سکا۔ اُسکا رونا بھی سچ ہے۔ چار سال تک اُسکا بوجھ اُٹھا کر اب گھر والے بھی تھک گئے ہیں۔ وہ اب ہر ایک پہ بار ہے۔ اس مرحلہ سے واپس لوٹ نہیں سکتا۔ موت کے دروازہ تلے بیٹھا سِسک رہا ہے۔ لیکن وہ سنگدل اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔ کتنا رقت خیز

انجام ہے۔

اُسکا انجام سامنے ہے۔ اپنے انجام کی سوچتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ میرا مرض ابتدائی مرحلہ پر ہونیکے باعث مجھ سے متعلقہ احباب کے دل میں ابھی امید باقی ہے۔ چنانچہ جسطرح بھی کریں انہیں میرے شاہی اخراجات برداشت کرنے ہی ہیں۔ اُس کی نا امیدی میں موت کا سکون ہے۔ میری امید میں زندگی کا اضطراب۔

جب اس مرض سے چھٹکارا حاصل کر کے بھی کوئی کام نہ کر سکونگا۔ زندگی کی جد و جہد میں حصہ نہ لے سکونگا۔ تو زندگی سے کیا حاصل۔ اگر یہ مرض مجھے اسطرح ناکارہ کر کے موت کی سکون زا وادی سے لوٹا لینا چاہتا ہے۔ تو میں اپنے ہاتھوں سے موت کا دامن تھام کر اس سے بدلہ کیوں نہ لوں؟

۱۵ ر اکتوبر:

علی الصبح سرد پانی سے نہایا۔ چھاتی میں درد ہونے لگا۔

۲۲ ر اکتوبر:

پہلے پانچ روز تو درد کی معمولی دوا کرتا رہا لیکن اب اسکا تسلسل ڈراؤنا معلوم ہو رہا ہے۔ انسان عجیب شے ہے۔ کئی مرتبہ کہتا ہے۔ خودکشی کر لونگا۔ لیکن جب خود موت سے روبرو ہوتا ہے۔ تو اسے پھر ڈر معلوم ہونے لگتا ہے۔ کسی کو کہتا ہے مجھ پر بندوق داغ دو۔ لیکن عین گولی چلنے کے وقت بندوق کا منہ ہاتھ سے بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گھر سے سندیسہ آیا تھا۔ کہ ۲۱ ر اکتوبر کو اچھا مہورت ہے چلے آؤ لیکن وہ کیا جانیں۔ یہاں تو ...... "بن بن کے بگڑتی ہے یہ قسمت میری"!!

۳۰ر اکتوبر:۔

درد کو افاقہ ہے۔ گھر جانے کیلئے مہورت کا انتظار ہے۔ ڈاکٹروں نے جو ہدایات دی ہیں۔ وہ مایوس کن ہیں۔ یہ نہیں کرنا وہ نہیں کرنا۔ بہت پیدل نہیں چلنا سائیکل نہیں چلانا گھوڑے پر نہیں چڑھنا چڑھائی پر نہیں جانا۔ خوراک شاہی کھانا۔ وہ کھانا یہ کرنا۔ فلاں دوائی کھانا۔ کوٹھی میں رہنا۔ گرمی میں پہاڑ پہ جانا اور خدا جانے کیا کیا کچھ۔ یہ سب کچھ مایوس کن ہے اسلئے کہ مجھ ایسا متوسط طبقہ کا انسان کیا یہ سب کچھ نباہ سکے گا۔ اور پھر متعلقین پر ایک بے فائدہ بار بننے سے حاصل ؟

۳ر نومبر:۔

کئی طرح کے خیالات کے باوجود میں اتنا کمزور ہمت نکلا۔ کہ آخر آج گھر آہی گیا۔ چلتے وقت ڈاکٹر نے کہا کہ "آئندہ موسم گرما بھی پہاڑ پر بسر کرنا" لیکن میں سوچ رہا تھا۔ ع

کس کو نصیب ہوتے ہیں پھر جلسہ ہائے عیش
جینا ہے کون دیکھئے اگلی بہار تک

۸ر دسمبر:۔

لاہور کو دھڑکتے دل کیساتھ روانگی ہے۔ سرینگر بھی خوب مزے سے دن کٹے جیسے کسی کو تاریک خانہ زنداں سے یکلخت کسی راج دربار میں لیجایا جائے جہاں حسین کے پاؤں گھنگرووں کی آواز پہ ناچ رہے ہوں اور زریں لباس شہزادے سنوا اچھال رہے ہوں۔ ایک ایسا ہی تضاد تھا میرے ساتھ بھی۔ جیتے تو دم کی تنہائیوں سے گھر آیا۔ تو چندر بخن کے بگیو پوریت پر گھر میں جشن تھا۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیئے۔ وہ رات رات

پھر ایک طرف خوش گلو عورتوں کے دلوں میں اتر جانے والے گیت اور انکے مقابلہ میں اس نوجوان پارٹی کا جسکے سرغنہ موہن لال تھے۔ وہ ماہیا گانا۔

ہاراں دیاں پنج لڑیاں   تیرا پچھا نہیں چھڈنا

بھاویں لگ جان ہتھکڑیاں

ادھر گلاب دیدی کے گھنگرو ادھر سائیں اندرداس کی ستار ادھر شام رانی کے ناچ ادھر نھنے ردی کی شیطانیاں غرض خوب وقت کٹا۔ اور میں وقتی طور پر تبدیلی تو کیا خود اپنے آپ کو بھول گیا۔ لیکن ناکے۔

پھر وہی میں ہوں وہی ....

بہر حال لاہور جا رہا ہوں۔ کئی بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملنے کے خیال گدگدا رہے ہیں۔

۱۱ر جنوری ۱۹۴۲ء:

ٹیکسلا کے کھنڈرات دیکھتا ہوں۔ ۱۱ر دسمبر کو لاہور پہنچگیا۔ اُن لوگوں سے جن سے آخری مرتبہ ملگیا تھا۔ پھر ملنا یقیناً پرمسرت تھا۔ پنر جنم کا احساس تھا۔ پارٹیاں دی گئیں۔ دعوتیں کھائیں۔ مبارکبادیں وصول کیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایک وقتی روشنی تھی۔ جو ٹوٹنے والے تارے کی طرح ایک بار آنکھوں کو خیرہ کر کے پھر اندھیرے میں غائب ہو گئی ہے۔

پھر تاریکی ہی تاریکی ہے۔ ڈاکٹر ہیں۔ کہ اپنی کہے جاتے ہیں۔ "خبردار کوئی کام کیا تو۔ ابھی قطعاً آرام کرو ورنہ مرض کے عود کر آنے کا خطرہ ہے۔ خبردار خوراک سے لاپرواہ نہ ہونا" اور پھر سینکڑوں روپے ماہوار کے حساب سے چارٹ بنا دیتے ہیں۔ ادھر جنگ کا

دیوتا ہے کہ اُس نے اچھے بھلوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے کھاتے پیتے گھرانے بھوکوں مرنے کی تیاری میں ہیں اور پھر تپ دق کا ایک پسماندہ مریض ——

کون ہے جو اسکے دل کی کیفیت کا اندازہ کرے۔ جسے تندرست ہونے پر ملنے والی ہر نئی مبارکباد ایک تازیانہ کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

دل بار بار جو عزم باندھتا ہے۔ اسے گناہ سمجھکر ہر بار رو باد دیتا ہوں۔ لیکن جب ہری چند اختر کا یہ شعر سنتا ہوں۔ تو سوچتا ہوں۔ کہ یقیناً یہ گناہ نہیں۔ ع

ناؤ کو اک ساحل تو ملا ہے طوفانوں سے چین تو ہے
موت ہے اچھا موت سہی میں اس گھاٹ اترتا ہوں

۱۷ فروری :——

تاریکی زیادہ گہری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بیماری کے دنوں میں میں جن دوستوں کی توجہ کا مستحق تھا۔ اب انہیں میری کوئی تخصیص نہیں رہی۔

اسوقت انکے التفات کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ جانتے تھے اگر یہ عنقریب مر جائیگا اسلئے انکے روزانہ معمول میں میری موت ایک کانٹا بنی رہتی تھی۔ جسکے باعث میں انہیں یاد آجاتا تھا۔ گو ہمدردی کے فلسفہ کیمطابق نفرت کیسے ردِ عمل کے طور پر ہی لیکن اب جبکہ میری موت بہت نزدیک نظر نہیں آرہی جہان والوں کو اتنی فرصت کہاں۔ کہ میری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔ یہاں باعمل کیلئے زندگی ہے لیکن ڈاکٹری مشورہ کیمطابق میں باعمل نہیں ہوسکتا۔ اور بے عمل کے لئے ہسپتال موزوں جگہ ہے لیکن وہاں سے نکالدیا گیا ہوں۔ چہ خوب کسے سناؤں کہ میرے لئے مریض ہو کر ہسپتال میں چلا جانا اس سے کہیں آسان تھا۔ لیکن اب اس مرض سے بچکر لوٹنا

اتنی ہی بڑی مصیبت بنگیا ہے۔ میرے مکرم استاد آغا بیدار بخت نے کتنا سچ کہا ہے

الغرض اس جہان فانی میں — موت ہے سہل۔ زندگی دشوار

لیکن سناؤں بھی تو سنیگا کون۔ وہ دوست جنہیں اپنے کاموں سے اسقدر فرصت نہیں کہ مجھسے پوچھیں "کہو کیسے گذرتی ہے"۔ یا وہ امیر دوست جنہیں رات کے وقت یہ کہلا بھیجنے کی فرصت تو ہوتی ہے۔ کہ "کل صبح ہمارا کوچ ہے۔ لیکن یہ خیال نہیں آتا کہ "آپ بھی ہمارے ساتھ آئینگے۔ ہماری کار میں جگہ ہے"۔ لیکن یہ توقع ہی کیوں یہ امیر لوگ کسی غریب کے مداح ہو سکتے ہیں۔ دوست نہیں اور یوں بھی کوئی خواہ لکھ پتی ہو، اسکے پاس اتنی گنجائش کہاں۔ کہ کسی فضول کام کے لئے اپنے خزانہ پہ بار ڈال سکے۔ ایسے موقعوں پر وہ خود مفلس ہوتا ہے۔ غالب تو خدا کو بھی کہہ گیا۔ ع

یارب تو کجائی کہ بہ ماز رندہی — بیدرد خدائی کہ بہ ماز رندہی

نے تے تو نہ غائبی و نہ بے رحمی — بے مایہ چو مائی کہ بہ ماز رندہی

بہر حال ان سے گلہ ہی کیا۔ بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ اپنی اس فضول اور لاحاصل زندگی کا بوجھ اپنے قرابت داروں پر بھی کبتک ڈالے رکھوں۔ کوئی کام کرنا ہو تو میرے سامنے نام مت لو۔ اور کھانا پینا ہو تو مجھے بہترین دو۔ یہ صورت حال خود مجھے پانی پانی کر رہی ہے۔ یوں زندگی کی دیگر لطافتوں سے بہرہ اندوز نہ ہو جوگ بھی تو نہیں رہ گیا۔ کہاں وہ دن۔ کہ چاندنی راتوں میں راوی کے سینے پر ناؤ چلانا۔ اور کہاں اب کہ دوستوں کیساتھ پانی میں تیر بھی نہیں سکتے۔ وہ پہاڑیاں پھاندتے پھرتے ہیں اور ہم دل مسوس کر رہجاتے ہیں قدم قدم پر اس مرض کا

احساس بستر میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ کہیں چھلانگ لگاتی نہیں کسی بے تکلف دوست سے چھینا جھپٹی کرنے پر تلے نہیں کہ کوئی قریب سے ٹوک دیتا ہے بس پھر نہ پوچھیے۔ کہ طبیعت کسقدر بیزار ہو جاتی ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ کہ "آرام آرام اور بس آرام"۔ لیکن وہ نہیں جانتے۔ کہ اپنے قرابت داروں کا دستِ نگر ہو کر آرام کرنا کسقدر بے آرامی کا باعث ہوتا ہے۔ خصوصاً مجھ ایسا حسّاس جو

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا !!!

کا قائل ہو۔ اب مزید اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکیگا۔ پھر وہی عزم دماغ میں ہیجان پیدا کر رہا ہے۔ نہیں جانتا کہ عنقریب کیا ہونیوالا ہے۔ کئی کئی باتیں ایکساتھ دماغ میں گھوم رہی ہیں۔ جنگ فوج .... نہیں اتنی دیر نہیں تو پھر.... لیکن بتانے سے کیا حاصل۔ آپ لوگ عنقریب خود ہی سن لینگے خیر اسوقت تو میں یہ ختم کر رہا ہوں۔ اور میرے ایک غمخوار سامنے بیٹھے کسی کا دیوان پڑھ رہے ہیں۔ اور مجھ سے اس شعر کی داد طلب کر رہے ہیں۔ ع

اے مرگِ ناگہاں تیری غیرت کو کیا ہوا
کیوں انتظارِ تیغِ ستم کر رہا ہوں میں

ٹنگمرگ۔ مئی سنہ ۱۹۴۱ء تا لاہور فروری سنہ ۱۹۴۲ء

باہتمام سریندر ناتھ ساہنی پرنٹر پبلشر سپریم پرنٹنگ پریس جموں سے شایع ہوئی